غالب

اور

صفیر بلگرامی

مشفق خواجہ

Scanned with CamScanner

غالب اور صفیر بلگرامی

مشفق خواجہ

عصری مطبوعات۔ کراچی

طبع اوّل : ۱۹۸۱ء

تعداد : ایک ہزار

کاتب : محمد شریف رگل

مطبع : المخزن پرنٹرز۔
پاکستان چوک۔ کراچی

قیمت : پچیس ۲۵ روپے

عصری مطبوعات

اے/۳۲۲۔ بلاک ڈی۔ نارتھ ناظم آباد
کراچی ۳۳

اردو کے صاحبِ طرز انشا پرداز

سیّد وصی احمد بلگرامی مرحوم

کے نام

○

اُستادِ من بشیوۂ اردو بود سحؔر — کز ناسخ است یافتہ تمغائے شاعری
در مرثیہ دبیؔر بود اوستادِ من — مقبولِ کبریا شدہ از مدحِ حیدری
غالؔب بود ہنرورِ شعرم بپارسی — گو ہست در زمانہ عَلَم با ہنروری
دارم بدل ذخیرہ ازیں ہا صنوفِ علم — چوں ابر مخزنِ گہر از نکتہ پروری
عمرم کہ از چہل متجاوز شدہ بچار — کردم بسے سیاحتِ اقلیمِ شاعری
از نثر و ہم ز نظم بسے قسم قسم را — دادم ز کلکِ خویش نگارش بزیوری
امّا چہ سود زیں ہمہ سودائے خامِ من — آیا چہ بہرہ زیں ہمہ علم و ہنروری
اکنوں بہند قدرِ زبانِ عرب نماند — در کارِ فارسی شدہ سیلابِ ابتری
اردو کہ بود حاصلِ ایں ہر دو پاک زاد — افتاد در تذلّل و شد از صفا بری

خاموش اے صفیؔر چہ نالی ز دستِ دہر
آخر بدہر ہیچ نماند چو بےنگری

غالب

پیدائش : ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء - وفات : ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء

صفیر

پیدائش : ۷ر اپریل ۱۸۳۴ء - وفات : ۱۲ر مئی ۱۸۹۰ء

فہرست

دیباچہ - ۷

صفیر بلگرامی - ۹

غالب و صفیر کی مراسلت - ۴۶

مکتوب صفیر بنام غالب (۱) - ۴۹

مکتوب صفیر بنام غالب (۲) - ۵۰

مکتوب صاحب عالم مارہروی بنام غالب - ۵۲

مکتوب شاہ عالم مارہروی بنام غالب - ۵۲

مکتوب غالب بنام صفیر (۱) - ۵۵

مکتوب صفیر بنام غالب (۳) - ۵۷

مثنوی "صبحِ امید" - ۵۸

مکتوب غالب بنام صفیر (۲) - ۶۸

مکتوب غالب بنام صفیر (۳) - ۷۰

مکتوب صفیر بنام غالب (۴) - ۷۱

مکتوب غالب بنام صفیر (۴) - ۷۶

مکتوب صفیر بنام غالب (۵) - ۷۹

مکتوب غالب بنام صفیر (۵) - ۸۲

مکتوب غالب بنام صفیر (۶) - ۸۸

غالب و صفیر کی ملاقات - ۸۹

دیباچہ رشحاتِ صفیر اور قطعۂ غالب - ۱۱۱

انشائے سبدِ گل - ۱۱۶

غالب کا ایک نایاب خط (۷)

بنام میر ولایت علی - ۱۱۹

مکتوب غالب بنام میر ولایت علی (۸) - ۱۱۹

جلوۂ خضر - ۱۲۳

مرقع فیض اور تنبیہ صفیر بلگرامی - ۱۳۱

محشرستانِ خیال - ۱۳۶

توضیح المقال فی شرح محشرستانِ خیال - ۱۶۸

مخمسات بر غزلیاتِ غالب - ۱۸۵

متفرقات - ۱۹۱

صفیر کی آپ بیتی - ۱۹۱

صفیر کی مزید تصانیف - ۱۹۱

مکاتیب غالب بنام صفیر کی مختلف اشاعتیں - ۱۹۳

کتابیات - ۲۰۰

دیباچہ

غالب اور صفیر بلگرامی کے تعلقات کے بارے میں میں نے ۱۹۶۹ء میں ایک مقالہ لکھا تھا جو سہ ماہی "صحیفہ" لاہور کے غالب نمبر (جلد دوم و سوم) میں شائع ہوا تھا۔ گزشتہ دس گیارہ برسوں میں اس موضوع پر مزید مواد دستیاب ہوا جس کی بنا پر اس مقالے کو از سرِ نو لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اور اب یہ مقالہ مکمل ہوا ہے تو ایک کتاب کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

میں نے کوشش یہ کی ہے کہ غالب و صفیر کے تعلقات کی تمام تفصیلات پیش کی جائیں، تمام متعلقہ تحریروں کو یک جا کیا جائے نیز صفیر نے غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی نشان دہی کی جائے۔ اس سلسلے میں میں نے متعدد قلمی اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کر کے بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہا ہے۔ اس کتاب میں غالب و صفیر کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ملیں گی۔ مکاتیب غالب بنام صفیر اور مکاتیب صفیر بنام غالب مکمل اور صحیح صورت میں پہلی مرتبہ پیش کیے جارہے ہیں۔

سید وصی احمد بلگرامی مرحوم کے کتب خانے سے مجھے بڑی مدد ملی ہے۔ موصوف عام طور پر اپنی کتابیں کسی کو مستعار نہیں دیتے تھے۔ مگر مجھ پر عنایت و شفقت کا یہ عالم تھا کہ اُن کا کتب خانہ گویا میرا ہی کتب خانہ تھا۔ جو کتاب بھی میں نے مطالعے کے لیے طلب کی، انھوں نے عنایت فرمادی۔ مرحوم کے دونوں صاحبزادوں سید ولی احمد بلگرامی اور سید احسان احمد بلگرامی صاحبان نے بھی اپنے والدِ مرحوم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مرحوم کے کتب خانے کے دروازے میرے لیے کھلے رکھے۔ میں اِن دونوں کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

کتاب مکمل ہونے کے بعد اس کے بعض حصوں میں کچھ نئے مباحث کے اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان مباحث کو متعلقہ مقامات پر درج کیا جاتا۔ ان کے لیے میں نے کتاب کے آخر میں "متفرقات" کے عنوان کے تحت ایک باب کا اضافہ کر دیا ہے۔

مشفق خواجہ

کراچی

یکم جنوری ۱۹۸۱ء

صفیر بلگرامی

سید فرزند احمد صفیر بلگرامی ساداتِ بلگرام میں سے تھے۔ اُن کا سلسلۂ نسب بیالیس واسطوں سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اور بیس واسطوں سے سید محمد صغریٰ فاتح بلگرام (م: ۶۴۵ھ/ ۴۸-۱۲۴۷ء) تک پہنچتا ہے۔

صفیر کے پردادا کے والد سید خورشید علی خورشید بلگرام سے آرہ (ضلع شاہ آباد) آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ خورشید اُردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ ان کے حالات "جلوۂ خضر"[1] میں ملتے ہیں۔

"۱۹ شعبان ۱۱۵۹ھ [۶ ستمبر ۱۷۴۶ء] ... بروز سہ شنبہ وقت نماز ظہر بمقام بلگرام ولادت پائی۔ 'ثمر حیات' (۱۱۵۹ھ) تاریخ ہے۔ ذوقِ علم جبلی تھا۔ سید محمد خلف علامہ عبدالجلیل بلگرامی کی خدمت میں علم حاصل کیا۔ آخر شعر کا ذوق دامن گیر ہوا۔ فارسی فرمانے لگے۔ پہلے شیخ صانع بلگرامی بعدہٗ شیخ محمد صدیق سخنور سے اصلاح لی۔ اس کے بعد حضرت آزاد [میر غلام علی] کو بذریعہ خط و کتابت حیدر آباد دکن اپنا کلام اصلاح کے لیے بھیجا۔ اُس وقت تک فصاحت تخلص کرتے تھے۔ حضرت آزاد نے خورشید تخلص بدل دیا۔

---

[1] کتابوں کے مکمل حوالے "کتابیات" کے تحت درج کیے گئے ہیں۔

اُس کے بعد شیخ علی حزیں علیہ الرحمۃ سے فیض پایا ..... آغازِ شباب میں بمقام کوڑہ جہاں آباد سرکار ظلِ سبحانی شاہ عالم بادشاہ میں سرفراز اور الف خاں رسالہ دار کے ہمراہ ہوئے۔ آخر بعد ترکِ روزگار پُورب میں تشریف لائے۔ نواب سیّد نورالحسن خاں بلگرامی کہ اُن کی قرابت قریبہ میں تھے اور ضلع شاہ آباد میں از طرف صاحبانِ انگریز بہادر متعہد تھے۔ خان صاحب نے اپنا کاروبار ان کے سپرد کیا اور انھوں نے کارہائے متعلقہ کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ جمیع امور میں مشیرِ خاص رہے۔ آخر سرکار انگریزی میں بھی مناصب عمدہ پر سرفراز ہوئے۔ بلیا کی تحصیل ان کے سپرد تھی کہ مرضِ لقوہ میں مبتلا ہوئے اور ۱۲ صفر ۱۲۰۱ ہجری [۴۔ دسمبر ۱۷۸۶ء] میں انتقال فرمایا۔ نعشِ مبارک اُن کی آرہ میں آئی اور زمین نوخرید میں جو احاطہ رمنہ کلکٹری میں ہے، مدفون ہوئے ..... کبھی کبھی فکرِ سخن زبان اردو میں بھی فرماتے تھے۔" (جلد اوّل، ص ۱۵۴)

صفیر کے پر دادا سیّد بندہ علی بندہ بھی شاعر تھے۔ ان کے بارے میں صفیر نے یہ معلومات فراہم کی ہیں:

"۱۲۲۳ ہجری [۹-۱۸۰۸ء] میں ..... حیدر آباد پہنچے اور سرکار نظام کے سفیر مقرر ہوکر رزیڈنٹ کے دربار میں حاضر رہے۔ آخر میر منشی فوجِ شاہی کے بھی ہوئے۔ ان کا نام اور فیض ملک دکن میں آج تک موجود ہے۔ املاک حضرت آزاد [میر غلام علی] کہ کسی سبب سے مہاجن کے پاس تھی، اس کو روپیہ دے کر چھڑایا اور اس میں مکان وغیرہ از سرِ نو بنایا۔ جناب پر دادا صاحب مدّتوں ملک دکن میں رہے ..... ۷ر فروری ۱۸۳۸ء مطابق ۹[1] ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ کو گھوڑے سے گر کر انتقال کیا۔" (جلوۂ خضر، جلد اول، ص ۶-۱۰۵)

صفیر کے دادا کا نام سیّد غلام یحییٰ اور تخلص یحییٰ تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے اور "نثر عاری میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے"۔ وہ بھی "حسب الطلب ملکِ دکن میں گئے اور برسوں رہے اور

[1] تقویم کے مطابق ۱۲ ذیقعدہ

مناصب عالی پر سرفراز ہوئے" (جلوۂ خضر، اوّل، ص ۱۰۶ متن وحاشیہ) سید غلام یحیٰی ۲۷ رمضان ۱۲۱۲ھ [۱۵ مارچ ۱۷۹۸ء] کو آرہ میں پیدا ہوئے اور وہیں ۸۶ برس کی عمر میں ۸ ذی الحجہ ۱۲۹۸ھ [مطابق یکم نومبر ۱۸۸۱ء] کو وفات پائی۔ (نسب نامۂ صفیر بلگرامی، مرتبہ سید وصی احمد بلگرامی، قلمی)

صفیر کے والد سید عبدالحی عرف سید احمد صفر ۱۲۳۲ھ [دسمبر ۱۸۱۶ء۔جنوری ۱۸۱۷ء] میں مارہرہ میں پیدا ہوئے۔حضرت صاحب عالم مارہروی کی بڑی بیٹی سے شادی ہوئی۔حیدرآباد دکن اور بہار میں مختلف ملازمتیں کیں۔ ۶۴ برس کی عمر میں ۲۸ شوال ۱۲۹۶ھ [۱۵ اکتوبر ۱۸۷۹ء] کو آرہ میں انتقال کیا۔سید عبدالحی بھی شاعر تھے اور ان کا تخلص احمد تھا۔ (طبقات کرام، سادات بلگرام، مولفہ صفیر، قلمی، ص ۶-۴۰۵)

صفیر نے اپنے حالات تین جگہ لکھے ہیں۔ اوّلاً "طبقات کرام سادات بلگرام" میں اور پھر "جلوۂ خضر" کی دونوں جلدوں میں۔اول الذکر کتاب میں صفیر نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وُہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ بقولِ صفیر یہ حالات ۱۲۸۷ھ [۷۱-۱۸۷۰ء] میں لکھے گئے تھے۔ (ص ۴۰۱)

"بر ذوق یافتگان حسن تواریخ روشن ومبرہن باد کہ تولد عاصی در قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ متصل علی گڑھ کول کہ از آنجا دو منزل واکبرآباد ہیجدہ کروہ و فرخ آباد پانزدہ کروہ است بخانہ جد مادری[۱] خود اتفاق افتاد بتاریخ بست و ہفتم ذی قعدہ سنہ ۱۲۴۹ یک ہزار و دو صد و چہل و نہ ہجریہ[۲] قدسیہ وشیخ کریم حسن صاحب[۳] کنبوہ کہ یکے از دوستان صادق الوداد والد ماجد بندہ ہستند قطعات تاریخ میلاد من صد ہا فرمودہ دیوانے ترتیب دادہ بخدمت والد ماجدم گزرانیدند۔ از آن

---

[۱] سید صاحب عالم مارہروی [۲] مطابق ۷ اپریل ۱۸۳۴ء [۳] منشی کریم حسن المتخلص بہ راغب و احقر

تاریخ "شمس الضحیٰ" بسیار پسندم آمد۔

هنگامِ ولادت من در دهلی سلطنت شاه عالم بادشاه بود[1]

. . . . بعمر دو سالگی بهمراهی جد ماجد خود سید غلام یحییٰ مع والده و جده خود بمقام بلگرام که الحال ضلع هردوئی است و از توابعات لکهنؤ است و لکهنؤ از آن جا دو منزل و قنوج پنج کروه و فرخ آباد پانزده کروه و کانپور سه منزل و وطن اصلی من و ابا عن جد من است وارد شدیم۔ و به محله میدان پوره بخانهٔ اصلی خود فرود آمدیم۔ رسیدن خود یاد ندارم اما دو یک سال که در آن جا توقف ورزیده شد درین توقف اکثر واقعات و واردات بحفظ این خود فراموش است که الحال اگر از مردمان میگویم تعجب می کنند و می فرمایند که طفل سه ساله را چه یاد خواهد بود حالانکه سمت و وضع مکان اندرون و بیرون همه یاد است و چون بهوشِ خود ببلگرام رفتم بدون ایما و اشاره بر یاد خود بمکان و بالائے خانه رفتم۔ غرض در ایام صبی چون از بلگرام روانهٔ مشرق شدیم وقت روانگی هم یاد نیست اما واقعات راه و رسیدن در شهرے عظیم که حالا مردمان اله آباد را نشان می دهند و شکار جانورانِ آبی که بر کشتی بودیم مع وضع کشتی و حاملانِ این بے دست و پا که اکثر از کشتی فرود آمده بر زمین می (؟) و مرا بر کتف و دوش خود می برداشتند و جا بجا وضع منازل و کیفیت فرود آمدن و کاروبار آن وقت همه یاد و در حافظه است۔ حتیٰ که رسیدن بمقام آره که منزل مقصود بود مع وقت فرود آمدن یاد است۔ یعنی قریب شام در خانهٔ فرجد[2] خود

---

[1] یہ سہوِ قلم ہے۔ ۱۲۴۹ھ میں شاہ عالم کے بیٹے محمد اکبر شاہ ثانی کی حکومت تھی۔
[2] فرجد: پدرجد (سید بندہ علی بندہ بلگرامی)

رسیدم ۔ و آن وقت ہجوم نسوان برادری از ہر چار طرف بود ،
جدہ و مادرِ من نیز ہمراہ بودند ۔ آن وقت بندہ درمیان آنہا و ہمہ باہم
بغلگیر می شدند ۔ ہمدران ہنگامہ بزرگہ مرا در کنار خود گرفت و بایوان
برد در خوانچۂ شیرینی بلکہ خوب یاد دارم کہ لڈّوے موتی چور نہادہ بود بمن
داد ۔ بعد ازان ہیچ یاد ندارم ۔ و آن وقت عمرم از چار سال متجاوز بود۔

چون بعد چار سال و چار ماہ و چار روز چار پاس چار
ساعت مکتب و ختنہ من شدہ جملہ در حافظہ محفوظ دارم ۔ بعد ازان
چندے بطریقِ تادیب بخدمتِ جد خود سیّد غلام یحییٰ بخواندنِ الف
با اشتغال نمودم تاکہ بعمر ہفت سالگی در مکتب خانہ ائمام عمزاد خود
سید فرزند علی و سید محمد علی ابنائے سید ابن علی بن سید بندہ علی بن سیّد
خورشید علی بلگرامی نزد معلے صاحب فیوض فقیر محمد خان نام ساکن محلہ
دودھ کٹورہ من محلات قصبہ آرہ ضلع شاہ آباد کہ از آبادی جانب
مشرق واقع است برائے تعلیم نشانیدہ شدم ۔

الکن زبانی کہ جوہر تیغ زبان و ارث آبائے این ہیچمدان
است چہ در خاندان پدری و مادری من اکثر مرد و زن ازین تمغا
ممتاز اند و کمتر اند کہ زبان شان صاف باشد ۔ اما این عقد لسان
فاتح ابواب فتوح و مفتاح قفل علوم و فنون است ۔ حضرت کلیم اللہ
بہمیں زبان از خدائے زمین و زمان ہمکلام شد و کلیم اللہ لقب یافت۔
آرے خوش گفتہ ام :

کلیم وقت ہیں ہم طور معنی ہے مکان اپنا
لقب لکنت کے باعث ہو گیا معجز بیان اپنا

بسیارے از رباعیات و مقاطع غزلہا و اشعار در اذکار لکنت خود گفتہ ام۔ از آن جملہ این رباعی است:

کیا کہیے کہ طبع کیسی گھبراتی ہے
لکنت مرے کہنے میں نہیں آتی ہے
اس عقدہ کا باعث سخن تر ہے صفیرؔ
بھیگے جو گرہ اور بھی جم جاتی ہے

جد الجد من سید خورشید علی خورشید تخلص ہم لکنت داشتند و بسیارے از اشعار در ذکر لکنت خود فرمودہ اند.......

الغرض چوں من برائے خواندن نزد استاذی فقیر محمد خان نشا نیدہ شدم بسبب الکن زبانی و ہم عالم نادانی عجب دقّت در خواندن واقع می شد۔ یاد دارم کہ معلم مرحوم من روزانہ سوائے من دیگرے را سبق دادن نمی توانست چہ از سحر تا نصف النہار یک سبق خواندن نمی توانستم چرا کہ عادت معلم من بود کہ انچہ خوانم از زبان خود خوانم۔ خود اعانت نمی کرد و لفظ را از زبانِ من می بر آورد گو کہ از لکنت یک ساعت بگذرد۔ و ہمیں طور سبق شام بود۔ ازین سبب و محنت طبیعت بندہ کند و سست می شد۔ رفتہ رفتہ حافظہ کہ بآن شورش بود کہ ذکرش بالا کردہ شد رو بکمی آورد حتّٰی کہ یادم ہست کہ گلستانِ سعدی ہفت بار سبقاً سبقاً خواندہ ام و باز فراموش کردہ ام و از تعلیم کردہ معلم تا این دم ہم ہیچ یاد ندارم۔

انچہ بر من کشود از فضل واہب العطایا بود۔ غرض از عمر ہفت سالگی تا عمر ہجدہ ۱۸ سالگی کہ دوازدہ سال شدہ از کتب فارسی بدولت معلم مرحوم بہرہ برداشتم و از آن ہمیں قدر حاصل شد کہ خط و کتابت

نوشت و خواند بخوبی می کردم ۔ و وجہ دیگر زیادہ ازین راج است کہ در عمر ہشت نہ سالگی وقتے کہ حرف شناس ہم چنداں نبودم و ہیچ نوشتن نمی توانستم مرا شوق جمع کردن کتاب پیرامون خاطر می بود ۔ ہرچند کہ ہیچ بہرہ نداشتم اما ردی و پرزہ ہا را جمع کردہ کتاب و بیاض ترتیب می دادم و از کاغذِ سادہ کتاب ہا می تراشیدم و در الماری تو بر تو می نہادم مثل کتب خانہ ۔

شوق تالیف وتصنیف

بیاد دارم کہ چوں فی الجملہ قوت نوشت و خواند شد قصص و حکایات کہ از مردمان می شنودم یاد می گرفتم ۔ بخانۂ من نابینائے بہاری نام بسلسلہ خدمت گزاران منسلک بود ۔ و آں قصّہ یعنی کہانی می گفت ۔ بعمر نہ سالگی قصّہ گل بکاولی ازو شنیدم و آں را بحیطۂ تحریر کشیدم ۔ اگرچہ خبط و بے ربط بود اما شوق تالیف وتصنیف از ہمان وقت دارم ۔

بعد ازان بہ ہمان ایام سید محمد رضا مفتون بن سید تبارک حسین قصّہ ''گنجینۂ محبت'' نام بزبان اردو تالیف کردند و ہر روز شبانہ نزد جد امجد من آمدہ در مجمع می خواندند ۔ بندہ ہم می نشست ۔ ولولۂ تالیف و تصنیف دامن دل گرفت چنانچہ بدون استمداد دیگرے بفیض عبارت مفتون قصہ آغاز کردم کہ عنوانش درست و عبارت چست بود ۔ اگرچہ این دم پیش نظر نیست اما یادم می آید کہ طریقے خوبے بود ۔ آرے :

سالے کہ نکوست از بہارش پیداست

چون فی الجملہ در نوشت و خواند مہارت بہم رسانیدم از نثر شوق تمام و

از نظم نفرت تام بود - بوستان ناپسند و گلستان مطبوع - چهل حکایت بطوع و رغبت می خواندم و از هم مکتباں در باب خوبیِ نثر و قبحِ نظم بحث ها می کردم و نمی دانستم که لمولفه :

از هر چه نفرتے بدلم جا گرفته است
آخر هماں انیس دل و جان می شود

چون از عمر نه سالگی در گذشتم و ایام رشد دریافتم در نامه و پیغام مهارت بهم رسانیدم - برادرم سید محمد حسن امیر که هم سن و هم مکتب و هم صحبت و هم مشرب و هم مذهب من بودند - و باهم محبتے مفرط داشتیم روزانه بعد فراغ از مدرسه باهم در لهو و لعب مشغول می بودیم - بروز تعطیل که پنجشنبه و جمعه باشد از مخترعات برادرم امیر انواع انواع ملاعب نادره بظهور می آمد و هر لعب را فصلے جداگانه و سامانش امیرانه بود -

حرف و خط

خط و حرف من نستعلیق و شکسته در فارسی و نسخ و ثلث در عربی است و دیگر خطوط مثل غبار و شفیعا وغیره که از ملاعبات و محسنات خوشنویسی است همه حاصل دارم -

خطِ نستعلیق اول در مکتب از معلمِ خود فقیر محمد خان مرحوم که نوعے خوش سواد بود حاصل کردم - و بعد ازان چیزے از جناب سید محمد اصغر صاحب بن سید میر علی بن سید پیر علی بلگرامی اصلاح گرفتم - و خط شکست از دیدن سواد بزرگان خود که همه شیوهٔ روشن علی جونپوری داشتند و چیزے کم و بیش خوش سواد بودند - مخصوص سید افتخار علی ذره و سید عبدالعلی و

سیّد مصطفیٰ علی و سیّد محمد تقی و سیّد نیاز حسین و سید حسن عسکری که حروف این شش خوش نویسان چابک دست دیدنی و خوش سوادی و نشست الفاظ را مدح کردنی است ۔ از حروف و خطوط اینها سواد برگرفتم ۔

و خط نسخ را چنیں ابتدا کردم که میر محمد یحییٰ بن سیّد بهادر علی پنجسوره بدست خود نوشتند ۔ اگرچه حروف شان اصلاحی نبود اما بجودت طبع شیوهٔ تبریز را اختیار کرده بودند ۔ برادرم امیر بطور تعلیم نقلش برداشتند ۔ مولف را هم که هنوز در مکتب خانه و با برادرم امیر هم سبق بود حوصله شد که پنجسوره نگارد ۔ از برادرم امیر طلبیدم ۔ ندادند ۔ ملالم شد ۔ بعد برخاست از مکتب شامگاهانه بخانه رفتم و قرآن قلمی برگرفتم و پنجسوره نوشتن آغاز کردم و سوادش پیش نظر داشتم تاکه تمامش کردم و فخریه در نظر برادرم امیر در آوردم ۔ باهم چیزے بحث طفلانه شد ۔ مرا شوق مشق دامنگیر شد ۔ و کم و بیش هر روز در نسخ چیزے می نوشتم ۔ مگر سواد حروف قرآن که پیش من بود در نظر می داشتم تاکه درست آید ۔

برادرم امیر بعد چندے آن شوق را ترک کردند و بنده همان طور مشغول می بود تاکه سیّد نورالحسن اخ کلانے برادرم سیّد محمد حسن امیر که در اوائل هم سبق می بودند و از من بسیار در عمر کلان بودند کتابِ ادعیه از من نویسانیدند ۔ چونکه ابتدا بود اکثر جا غلطی واقع می شد ۔ باز از سرِ نو می نوشتم ۔ در همیں ردّ و بدل اتفاق نوشتن بسیار روداد تاکه جد امجد من از نوشتن من آگاه شدند و از من فرمودند که قرآن را نقل کنم ۔ و در آں ایّام کاغذ شیلو رام پوری که نو آغاز شده و یک روپیه فی دسته از سوداگرے که تازه وارد

از کلکته شده بود برائے نوشتن قرآن خرید فرمودند و من از قرآن نوشتۂ میر افتخار علی ذره نقل می برداشتم تا که نصف قرآن نوشتم ۔ بعد از آن قرآن مطبوعہ مطبع حسنی میر حسن رضوی از لکھنؤ آمد و جد امجد ہدیہ گرفتند۔ چند پاره از آن نقل برداشتم ۔ دریں عرصہ تحفۃ العوام مطبوعہ از لکھنؤ رسید ۔ بنا بر فرمایش سید محمد حافظ صاحب بن سید محمد عسکری نقلش گرفتم کہ ہنوز نزد شان موجود است۔

آخر ہمراه والد ماجد خود بمقام تاج پور ضلع ترہت رفتم۔ در آن جا ہم مشغلہ نوشتن قرآن بود تا کہ شاه محمد اکبر خوش نویس لاہور مسافرانہ تشریف آوردند ۔ خطِ یاقوتی و خط ثلث خوب می نوشتند۔ باستبداد جناب والد برائے تعلیم من چندے در تاج پور پا فشردند و خط و سواد من درست کردند و نکات و کنہیات را آموختند۔ خط نسخ و خط ثلث ہر دو از آن چابک دست برگرفتم ۔ ایں ہمان خط است کہ از دست من مردمان می بینند ۔

از دستِ خود در نسخ و ثلث تفسیر توضیح المجید اردو جناب مولوی سید علی صاحب لکھنوی یک جلد بفرمایش سید امام صاحب کہ خالو خالوے من است نوشتہ ام کہ در کتب خانہ شان موجود است۔ و دیگر قرآن شصت ورقی و سی ورقی آغاز کرده بودم کہ نا تمام ماند۔ و امسال پنجسوره بفرمایش برادرم سید محمد جان صاحب بن سید ابو محمد صاحب در چار روز نوشتہ ام ۔ و دیگر ادعیہ وغیره را حساب نیست ۔ و خط طغریٰ ہم از شاه محمد اکبر ممدوح آموختہ ام ۔ درستی طغریٰ در وضع من بسیار است ۔ یعنی طغریٰ چناں می نویسم کہ خواننده

بے تکلف خواندن می تواند ۔ بخلاف دیگراں کہ طغرائے شاں ہرگز خوانده نمی شود ۔ طغرائے اقسام در تفسیر توضیح المجید نگاشتہ ام ۔ و ہم در پٹکہ ہائے علم نقرہ و طلائی کربلا کہ در ۱۲۹۹ ہجری نذر کردہ شدہ ..... طغری درست کردہ ام ۔ و دیگر جا بجا طغرائے نوشتۂ من موجود است ۔

و بخط نستعلیق بسیار کتاب ہائے فارسی و اردو نگاشتہ ام ۔ اکثر کتب مطبوعہ چاپہ خانہ عظیم المطابع پٹنہ و شمس الضحائے مظفر پور و نور الانوار آرہ کہ این ہمہ از آن من بود اند بدست و قلم من نوشتہ شدہ و شیوہ شکستہ مسودہ ہائے بسیار دارم کہ بستہ ہا از آن پُر است ۔

اُستاد اُستادِ من در حرف و خط اول فقیر محمد خان مرحوم ، دوم سید محمد اصغر صاحب موصوف ، سوم شاہ محمد اکبر لاہوری ۔ و در علم و فن اول فقیر محمد خان ، دوم سید محمد عسکری ، سوم میر امامی ، چہارم سید محمد مہدی ، پنجم سید غلام یحیٰی ، ششم مولوی محمد بخش خاں وکیلِ پٹنہ ۔ در علوم متنوعہ ، ہفتم مولوی حسین علی ڈپوٹی کلکٹر ساکن گیا ، صاحبِ گنج در علم طب ۔ و در شعر و سخن اول سید محمد مہدی خبر ، دوم سید رضا حسین بلگرامی طبیب ، سوم شیخ امان علی سحر لکھنوی ، چہارم اسد اللہ خان غالب دہلوی ، پنجم مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی ۔ و کلام فارسی و اردو اساتذۂ مسلم الثبوت ۔

شعر و سخن ایں فن را ہم علی الرغم برادرم محمد حسن امیر آموختہ ام ۔ حکایتِ آغازِ سخن گوئی من عجیب است چہ در ابتدا نوشتہ ام کہ از نظم نفرت تامہ داشتم ، باز ایں شاہد رعنا در کنارم چگونہ آمد ۔ بشنو کہ بعمر چاردہ سالگی کہ ہنوز بمکتب خانہ جا داشتم نہ جد امجد من مرا با دختر سید وزیر علی بن سید افتخار علی بموضع کواتھ پرگنہ

دنوار کتخدا کردند ۔ و برات از قصبہ آرہ روانہ شدہ ۔ تا این دم ذوق شاعری نداشتم و ہیچ ازیں بہرہ نبود۔

در آخر ہمیں سال چون بہ آرہ آمدم شیخ ضمیر احمد مرحوم بلگرامی برائے کتخدائی خود با دختر ہمشیرہ حکیم محمد علی بہ آرہ رسیدند ۔ چون شیخ مرحوم از ہم سنانِ بندہ بودند شب عقد در جلسہ دور دور مایان بود۔ ہرگاہ برات از پھاٹک کہ خانۂ نوشاہ بود بخانۂ عروس کہ خانۂ حکیم محمد علی صاحب بود رسید و آنجا صورت بزم نشاط انعقاد یافت و سازندگان و نوازندگان بر روئے کار آمدند ناگاہان بدون سببے پردہ از دل من برداشتند و جوشے و خروشے در طبیعتِ موزونِ من حاصل آمد کہ شرح آن ممکن نیست و بیتابانہ از بزم برخاستم و بہ خانۂ خود آمدم ۔

نصف شب باقی بود ۔ دوات و قلم برگرفتم ۔ و دد مصرع ہائے طرح از طبع خود تراشیدم ۔ حالانکہ تا این دم ہیچ از روش و طریق ایں فن واقف نبودم ۔ چوں الحال می بینم آں طرح درست و بجا بلکہ از طرح بر آوردۂ قدما است کہ من تا آں دم اصغا نکردہ بودم و آں طرح مصحفی است :

دیکھنا کس کا، وہاں درزنک ہی جانا منع ہے

روزنِ دیوار سے آنکھیں لڑانا منع ہے

اشعار خود یاد ندارم ۔ اگرچہ مضامین پوچ بود مگر ایں قدر می دانم کہ مہمل و ناموزوں نبود ۔ و طرح غزل دیگر نیز یادم نیست ۔

چونکہ بایں فن عادت نداشتم باظہار آں شرمم می آمد۔

از مردمان مخفی می داشتم و ہر روز طرحے تازہ می کردم و مشق می نمودم و دواوینِ اساتذہ وکلامِ شعرا در نظر می داشتم۔ اوّل مشق اُردو چندے کردم۔ آخر بوجہ سبقِ دواوین سیّد افتخار علی ذرہ و سیّد محمد خورشید امامی شوق فارسی بہم رسانیدم۔

واہب العطیات جلت عظمتہ در بندہ قوتے ودیعت نہادہ کہ از عہدۂ شکرش بر آمدن نمی توانم۔ یعنی قوت تقلیدی در بندہ آں چناں است کہ از ہر چیز کہ نقل می بردارم اکثر مثل آں می نگارم۔ چہ در تحریر و چہ در تقریر و مقابل ہر چیز کہ می گویم فکرم مثلش می تراشد کہ بارہا تجربہ شدہ کہ بمقابل کلام شاعرے اگر چیزے بہماں وضع گفتہ ام و مخفی در کلامش منظم کردہ ام بینندہ و شنوندہ را ہیچ تمیز نمی شود۔ بلکہ ازو می داند تاکہ من نگویم و خیال می کنم کہ ایں امر آں دم بطریق احسن صورت می پذیرد کہ کلامش را ساعت دو ساعت بغور بخوانم و زیادہ ہر قدر کہ خوانم قوت تقلیدی در ہیجان می آید۔ آخر بعد بند کردن کتاب نظماً یا نثراً ہر چیز کہ باشد تا دو ساعت در دل و دماغ من اثر الفاظ و فقرات و وضع نشست و برخاست الفاظ بجا می ماند۔ و در آں وقت اگر خواہم بوضع آں نوشتن می توانم۔

چونکہ سالہا سال مشق نظم و نثر فارسی و اردو و دواوین اساتذہ پیش نظر داشتہ و بر طرح آنہا فکر کردہ ام طبیعت من دریں امر پختہ شدہ۔ روزے در دیوان صبائے لکھنوی کہ قلمی بود چار پنج غزلیات خود بوضع صبا منظم کردم چہ آں دیوان نوشتۂ قلم من بود موجب حیرت نظارگیان شد۔ تاکہ اظہار و اقرار نکردم کسے ندانست کہ آں غزلیات

از من است :

کجا بودم اکنوں فتادم کجا

عنان قلم شد ز دستم رہا

ہرچند کہ ایں ہمہ بیان کردہ شد محمول بر طفل مزاجی وخودستائی است و خودستائی عیب است اما در راستی چہ عیب - خدا عالم الغیب است -

بالآخر چوں از ملاعب طفلانہ تجاوز کردہ شد بجانب ملاعب جوانانہ رجوع کردہ آمد - بوقت ہوشیاری رغبت طبیعت چندے جانب گنجفہ و شطرنج وغیرہ شدہ و دو سہ سال علی التواتر و توالی اتفاق باختن افتاد - آخر دل سیر شدہ و گویا عہد کردہ آمد کہ باز پیرامون ایں چنیں ملاعب کہ سراسر معایب است نگردم - و حالا طبیعت آں چناں متنفر است کہ جائے کہ ایں ہمہ لہو و لعب می شود خاطر بے اختیار برخاستہ می شود - و "تا اختیار ایں کارخانہ را برہم می کنم و روبروئے خود آغاز کردن نمی دہم - گویا ایں امر جبلّی شدہ - از ہمہ ملاعب پتنگ بازی است کہ دل وحشت منزل را می آساید - اگر ایں مشغلہ ہم ندارم مگر ذوق آں در دل است -

الغرض چوں بعمر پانزدہ سالگی رسیدم برادرم امیر را ہم نائرۂ شوق سخن گوئی در کانونِ سینہ مشتعل شد در راہ فارسی قدم گذاشتند - و از سید محمد رضا مفتون کہ در فارسی رضا تخلص می کردند مشورہ کردند - بندہ در آں زماں دیوان و مثنوی میر امامی در مزاولت داشت - فیوضاتِ باطن جنابِ موصوف خضرِ راہ من شدہ قدم دریں راہ نہادم - و برطرح جناب ممدوح می گفتم انچہ می گفتم - غرض در اندک مدتے دیوانِ فارسی و مثنوئ فارسی ترتیب دادم -

برادرم امیر حسب عادت خود آں شغل را ہم بگذاشتند۔ بندہ ہم چناں محو زلف وخط و خال ماند۔

آخر از فارسی دل برداشتم و بجانب اردو گماشتم۔ایں وقت عمرم بہ شانزدہ سالگی رسیدہ باشد۔ واسوخت اُستاذ ناسخ لکھنوی پیش نظر داشتم و واسوختے بہ تقلیدش گفتم و ہم چنیں مثنوی اردو بوضع میر حسن نظم کردم۔ و دریں روزہا تخلص من گاہے قطب و گاہے نالاں و گاہے آثم و گاہے اثیم شدہ۔ اما ہنوز کلام من ہم سنان می شنیدند۔ و از بزرگان و شعرا مخفی می کردم۔آخر شوق کتب بینی دامنگیر حالم شد۔ و شب و روز کتاب ہر علم کہ پیش می آمد می دیدم وگل حکمت می چیدم۔

ناگاہ صیت کتخدائیِ برادرم غلام حسنین صاحب قدر بلگرامی با دختر سیّد محمد تقی صاحب بگوش من رسید۔ بمقام کواتھ رفتم و از ملاقات برادر موصوف کہ ہم سن و ہم عمر و ہم نام من از روئے تاریخ ولادت من کہ غلام حسنین باشد و ہم مذہب و ہم مشرب من اند و آخر ما او ہر دو شاگرد یک استاد یعنی سحر و غالب حظ ہا برداشتم۔ تا آں دم برادرم قدر با شعر و سخن سرے نداشتند۔ اما مذاق بود۔ در کواتھ از میر تفضل حسین غازی پوری کہ از شعر و سخن بہرہ داشتند اتفاق مطارحہ شد۔ از آں وقت حال شعر و سخن گفتن من بر مردمان روشن شد۔

اگرچہ اوّل اوّل بزرگانم ازیں شغل مانع شدند امّا جبلّت کجا می رود۔ در تاج پور کہ اتفاق ماندن دو سہ سال شد و قاضی مولوی رضی الدین احمد متوطن دربھنگہ در تاج پور قاضی بودند بر من شفقت بسیار داشتند و اکثر باعث مشق شعر و سخن شدند۔ و انچہ گفتم در اطراف و

اکناف مظفر پور مشہور فرمودند بلکہ در ہر قصبہ و دیہہ شہرتم افزودند ۔
در این وقت تخلص من صفیر شدہ کہ تا این دم باقی است ۔

آخر ذوق سخن مرا تا لکھنؤ برد ۔ و اوّل شاگردیٔ حضرت سحر
لکھنوی کردم ۔ و در غزل بہرہ برداشتم ۔ حضرت برق و حضرت بحر ہم
زندہ بودند ۔ و بعد غدر شاگردیٔ حضرت دبیر در مرثیہ اختیار کردم ۔

علم و فن

در عربی تا کافیہ خواندہ ام از مولوی محمد بخش خان صاحب وکیل
پٹنہ ۔ چون در مدت قلیل خواندہ بودم و مزاولت ہم کردہ نشد این قدر قوت
بہم رسانیدہ بودم کہ معنی عبارت را می فہمیدم و حالا ہم ممکن است مگر
راست این کہ مشغلہ این بالکل ندارم ۔

و در فارسی از بزرگان خود کہ نام آورانِ دہر بودند اکتساب
کردہ ام و بہرہ وافی دارم ۔ الحمد للہ ۔ و در اردو انچہ از تحقیقات خود
کتاب ہا نوشتہ ام از آں روشن است ۔ از آنہا یکے رشحات صفیر است
کہ طبع شدہ ۔ دیگر رسایلے ہنوز قلمی است ۔

فہرست تصانیف مجلد و مدون وغیر آں

دیوان فارسی	سہ
مثنویات فارسی	چہار
دیوان اردو	ہفت
دیوان اردو مخصوص غزلیات	
مشاعرہ	یک

مثنویات اُردو	۴۷
واسوخت	چہار
مرثیہ	یک صد و پنج
سلام	ده
رباعیات	سہ صد
مخمس	یک صد و ہفت
قطعات	بست
قصاید فارسی	دو
قصاید اردو	پنج
قصۂ بوستان خیال اردو	ہجدہ جلد
قصہ ہائے دیگر بر روش ایشیا	ہفت
جوہر مقالات بطرز مرأۃ العروس	۳ جلد
مجموعۂ فیض صفیر در علم شعر	۲۱ جلد
گلبن موزوں انتخاب اشعار ہر قسم	۳۳ جلد
بیاض اشعار اساتذہ	دو
مناظرۂ زلف و رُخ	دو
ترجمۂ تفسیر منہج الصادقین	یک
ترجمہ کتب مختلفہ	پنج
تحریرات ہر قسم	دو صد
جواب سوالات مختلفہ	بست و پنج
مرغوب القلوب حال انبیاء و ائمہ علیہم السلام	دو

صراط المستقیم قیامت نامہ	یک
فالنامہ موسوم بہ سترغیب	یک
راحت طفلی	یک
دغدغۂ موت	یک
جوشِ وحشت	یک
شورِ محشر	یک
مجموعہ بحر زخار	یک
جام کوثر	یک
معراج العقول در عظمت آل رسول	یک
شبستانِ معراج	یک
تذکرۂ جلوۂ خضر	یک
محشرستانِ خیال	دو جلد
تاریخ بلگرام	۳ جلد

شاگرد

بخدا قسم انچہ در "مرقع فیض" نوشتہ شدہ و ہر تعداد و ہر نام شاگرد کہ در مرقع فیض است صحیح و درست و حقاً و ایماناً ہست گو بعض ازینہا سرتابی کردہ جادۂ انحراف پیمودہ باشند۔ آخر ثابت کردہ شدہ و بجز خاموشی کہ عین اقرار است پیش آنہا ہیچ جوابے نماندہ کہ از نمیقۂ محبت ہر دو حصہ و تہذیب المقال ہویدا ست۔

و بعد این گفت و شنید نیز بسیارے از کسان شاگرد من شدہ اند۔ یکے از آن محمد [ابوالفضل] فضل تخلص[1]۔ دوم شیخ محمد واجد؛ واجد ددبد

---

[1] بعد میں تخلص "حشر" اختیار کیا۔

تخلص - سومی عطا حسین خاں عطا تخلص"۔ (ص ۱۵ - ۱۰۹)

صفیر نے اپنی تصانیف کی جو فہرست دی ہے اُس کے مطابق تصانیف کی مجموعی تعداد ۱۵۹ ہوتی ہے ۔ واضح رہے کہ اس فہرست میں وہ تصانیف شامل نہیں ہیں جو مذکورہ فہرست کی ترتیب (۱۲۸۰ھ) کے بعد صفیر نے لکھی ہیں ۔ تصانیف کی بہ کثرت محض اس وجہ سے ہے کہ صفیر نے ایک رباعی کو بھی ایک تصنیف قرار دیا ہے ۔ "تحریراتِ ہر قسم" کی تعداد دو سو ہے ۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطوط وغیرہ کو شمار کیا ہوگا ۔

صفیر کی تصانیف کی کوئی مکمل فہرست تیار کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ تصانیف کی بڑی تعداد طباعت سے محروم رہی اور جو تصانیف مسودوں کی صورت میں تھیں اُن میں سے بہت سی ضائع ہوگئیں ۔ مطبوعہ تصانیف بھی کمیاب ہیں ۔ اس لیے یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ صفیر کی کتنی تصانیف طبع ہوئیں ۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے صفیر کی تصانیف کی فہرست بڑی محنت سے مرتب کی ہے[1] لیکن یہ بھی مکمل نہیں ہے ۔

صفیر کی تصانیفِ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کا سب سے بڑا ذخیرہ سید وصی احمد بلگرامی مرحوم کے کتب خانے[2] میں ہے ۔ میں نے ذیل کی فہرست اسی کتب خانے سے استفادہ کر کے تیار کی ہے ۔ جو کتابیں اس کتب خانے میں نہیں ہیں ، اُن کے لیے میں نے ڈاکٹر ظفر اوگانوی کے تحقیقی مقالے "صفیر بلگرامی ، حیات اور کارنامے" سے استفادہ کیا ہے ۔ اور جہاں کہیں "حیات" کا حوالہ دیا گیا ہے ، اس سے مراد یہی کتاب ہے ۔

۱- دیوان صفیر بلبل

اردو ۔ مطبوعہ ۔ مطبع نور الانوار آرہ ، ۱۲۸۰ھ [۶۴ - ۱۸۶۳ء] - ص ۱۳۶ - یہ صفیر کا پہلا

---

[1] صفیر بلگرامی ، حیات و کارنامے ، ص ۱۸۱ - ۹۱

[2] آیندہ سطور میں "کتب خانۂ بلگرامی" کے الفاظ اسی کتب خانے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں ۔

مجموعۂ کلام ہے جس میں ۵۳۵ غزلیات ، ۳ مخمس ، ۱۵ رباعیات اور ۴ پہیلیاں ہیں۔

۲۔ دیوان خم خانۂ صفیر

اردو ۔ مطبوعہ نور الانوار آرہ ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء] ۔ ص ۱۶۲۔ اس مجموعے میں ۱۲۶۴ھ [۴۸-۱۸۴۷ء] سے لے کر ۱۲۹۶ھ تک کی وہ غزلیں ہیں جو مختلف مقامات (الہ آباد ، بلگرام ، بنارس ، پٹنہ ، دہلی ، رام پور ، علی گڑھ اور لکھنؤ وغیرہ) کے مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں۔

۳۔ دیوان سوم

اردو ۔ قلمی ۔ اس دیوان میں وہ ۲۵۵ غزلیں ہیں جو گلدستہ "پیام یار" لکھنؤ اور دیگر گلدستوں میں شائع ہوئیں یا مختلف مشاعروں کی طرحوں میں لکھی گئیں۔

۴۔ حالیہ کلام

اُردو ۔ زمانۂ تصنیف محرم ۱۲۹۷ھ [دسمبر ۱۸۷۹ء ۔ جنوری ۱۸۸۰ء] ۔ صفیر نے جدید انداز میں ، حالی کے رنگ کی ۱۳ غزلیں اور ۹ رباعیاں کہیں۔ یہ کلام بخطِ مصنف محفوظ ہے اور رسالہ "قومی زبان" کراچی بابت دسمبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ دیوان خمسہ جات

اردو ۔ قلمی ۔ ص ۱۳۶ ۔ اس دیوان میں ۳۳ شعراء کی ۱۷۰ غزلوں پر مخمس لکھے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر ۶۲۵ بند ہیں۔ جن شعراء کی غزلوں پر مخمس لکھے گئے ہیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں؛ مصحفی ، غالب ، آتش ، اسیر ، بحر ، سحر ، شاہ نصیر ، ناسخ۔

صفیر نے اپنی تصانیف کی جو فہرست مرتب کی ہے ، اُس میں اِس دیوان کا ذکر نہیں ہے ، لیکن مخمسات کی تعداد لکھی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ زیرِ نظر دیوان میں جو مخمسات ہیں ، اُن کا بڑا حصہ ۱۲۸۷ھ (سالِ ترتیب فہرست) سے پہلے کا ہے ، لیکن دیوان کی ترتیب اس سنہ کے بعد عمل میں آئی ہوگی۔

۶ - دیوانِ رباعیات

اردو۔ قلمی - ص ۱۲ - اس میں ۹۱ رباعیاں ہیں - سات فارسی رباعیاں بیاض صفیر (قلمی) میں ہیں - ۱۴ رباعیاں دیوان صفیر بلبل میں ہیں - جلوۂ خضر (دوم ، ص ۲۲۸) میں دس اور مرقع فیض (ص ۸ - ۱۰۶) میں بیس رباعیاں ہیں۔

۷ - مراثی

صفیر نے اپنے مراثی کی تعداد ۵۰۱ لکھی ہے ، لیکن اب صرف ذیل کے آٹھ مرثیے محفوظ ہیں۔ ان میں سے چھٹا مرثیہ مطبوعہ ہے - باقی قلمی صورت میں ہیں :

۱ - مرثیہ در احوال عون و محمد فرزندانِ زینب - ۶۴۳ بند

جب دشت میں بہارِ گلِ نیلو فر ہوئی

۲ - مرثیہ در حال علی اصغر - ۱۹۰ بند

جب خاتمہ بخیر ہوا فوجِ شاہ کا

۳ - مرثیہ در واقعاتِ شام - ۹۸ بند

داخلہ عترتِ اطہار کا دربار میں ہے

۴ - مرثیہ رخصت و شہادت حضرت امام حسینؑ - ۷۹ بند

ہے فوجِ اشقیا کی چڑھائی حسین پر

۵ - مرثیہ در ذکر آلِ رسول - ۳۶ بند (نامکمل)

دنیا سرا ہے اور مسافر مقیم ہیں

۶ - مرثیہ در شہادت و وصیت علیؓ - ۳۰۴ بند

اے رونقِ جناں مرے باغِ سخن میں آ

یہ مرثیہ " دربار حسین " مولفہ سید افضل حسین ثابت رضوی (ص ۷۲ - ۲۲۵) میں شامل ہے۔

۷۔ مرثیہ درحالِ حضرت حُر ۔ ۲۴۴ بند

اے تولّائے علی خُلدِ معلّٰی دکھلا

۸۔ مرثیہ ازوفات رسول اللہ تا دربار شام ۔ ایک ہزار بند

ہاں برق طور نظم تجلّی فشاں ہو آج

۸۔ واسوخت

اردو۔ صفیر نے اپنی تصانیف کی فہرست میں چار واسوخت درج کیے ہیں ان میں سے اب صرف دو ملتے ہیں جو شعلۂ جوّالہ میں شامل ہیں۔ ایک واسوخت ۶۸ بند کا ہے اور دُوسرا ۵۵ بند کا۔ (شعلۂ جوالہ، دوم، ص ۴۲ - ۶۲۰)

۹۔ قصائد

صفیر نے اپنی تصانیف کی فہرست میں پانچ اُردو قصائد کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اب صرف دو قصیدے دستیاب ہوتے ہیں۔

۱۔ زمزمۂ صفیر

مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۳۰۴ھ ۔ ص ۱۶ ۔ یہ ملکہ وکٹوریہ کا قصیدہ ہے جو جشنِ جوبلی واقع ۱۸ فروری ۱۸۸۸ء کی یادگار کے طور پر لکھا گیا تھا۔ یہ قصیدہ پہلے آرہ گزٹ بابت ۱۷ فروری ۱۸۸۷ء میں شائع ہُوا تھا۔ یہی قصیدہ دعائیہ اشعار کی تبدیلی کے ساتھ مہاراجہ بیلانند بہادر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا اور اس کا نام "نذر الانظار" رکھا گیا تھا۔ "نذر الانظار" کا ایک قلمی نسخہ خدابخش اورینٹل لائبریری بانکی پور پٹنہ میں (نمبر ۲۰۲) ہے۔ آرہ گزٹ کے مذکورہ شمارے میں صفیر کا ایک قصیدہ دعائیہ بطور ترجیع بند بھی شائع ہوا تھا۔ (حیات، ص ۱۳۱ - ۱۲۹)

۲ ۔ مذکورہ لائبریری میں ایک اور قصیدے کا قلمی نسخہ (نمبر ۲۰۲) ہے ۔ اس کا مطلع ہے:

نرگسِ جادو نے کس کی کر دیا کفر آشکار
پھول ہیں اپنی رگوں سے باغ میں زنّاردار

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس قصیدے کا ممدوح کون ہے۔ (حیات، ص ۱۳۲-۱۳۱)

۱۰۔ شبستانِ معراج

اُردو۔ یہ واقعۂ معراج سے متعلق ۴۴۵ بند کا طویل مسدس ہے جس میں صفیر نے یہ نیا انداز اختیار کیا ہے کہ درمیان میں واقعاتِ کربلا بھی بیان کر دیے ہیں۔ یہ مسدس "میلادِ معصومین" میں شامل ہے۔

۱۱۔ مثنوی فتنۂ عشق

اردو۔ قلمی۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ (نمبر ۵۲) خدا بخش اورینٹل لائبریری میں ہے۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اس کا سالِ تصنیف ۱۲۷۲ھ لکھا ہے اور یہ قطعۂ تاریخ درج کیا ہے:

جبکہ یہ مثنوی تمام ہوئی کھل گیا لالہ زار فتنۂ عشق
دیکھ کر صفیر بولے دوست (کذا) واہ کیا ہے بہار فتنۂ عشق

۲ ۷ ۲ ۱ ۵

"اس کا پلاٹ بھی شوق اور اثر کی مثنویوں کی طرح ...... ایک رومانی المیہ ہے۔" (حیات، ص ۱۱۳)

۱۲۔ مثنوی صبحِ امید

فارسی۔ تاریخ تصنیف ۸ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ [۵ امئی ۱۸۶۴ء]۔ اس مثنوی کا متن آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ "انشائے سبدگل" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی "مطبع بابو سنت پرشاد صاحب" سے چھپی تھی۔ سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کے پاس مطبع نور الانوار آرہ کے ۱۲۸۳ھ کے ایڈیشن کا ایک نسخہ ہے۔ (حیات، ص ۱۴۰) یہ مثنوی "جلوۂ خضر" جلد دوم (ص ۲۳ - ۲۲۱) میں بھی شامل ہے مصنف کا اصل مسودہ جس پر غالب کے قلم سے اصلاحیں ہیں، کتب خانۂ بلگرامی میں موجود ہے۔

۱۳۔ مثنوی ہفت گوہر

اردو۔ قلمی۔ سالِ تصنیف ۱۲۸۵ھ [۶۹ - ۱۸۶۸ء]۔ ص ۱۶۳۔ یہ نظامی کی مثنوی "ہفت پیکر" (قصۂ بہرام گور) کا منظوم ترجمہ ہے۔

۱۴۔ مثنوی دعوتِ احباب

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۲۹۱ھ [۷۵ - ۱۸۷۴ء]۔ ص ۸۷۔ تعداد اشعار ۱۱۰۳۔
اس میں صفیر نے اپنے سفر غازی پور کا حال لکھا ہے۔ جن لوگوں سے اُن کی ملاقات ہوئی اور جن دعوتوں میں انھوں نے شرکت کی، اُن سب کا ذکر کیا ہے۔

۱۵۔ مثنوی صحبتِ احباب

اردو۔ قلمی۔ سالِ تصنیف ۱۲۹۱ھ۔ تعداد اشعار ۲۰۶۔ اس مثنوی میں الہ آباد کے سفر کی تفصیل ہے۔

۱۶۔ مثنوی قندِ مکرر

اردو۔ قلمی۔ ص ۴۰۔ تعداد اشعار ۳۲۷۔ یہ دراصل مثنوی دعوتِ احباب کا خاتمہ ہے۔ صفیر دوبارہ ۱۲۹۴ھ [۷۸ - ۱۸۷۷ء] میں غازی پور گئے تھے۔ یہ خاتمہ اسی سفر سے متعلق ہے۔

۱۷۔ مثنوی معراج الخیال

فارسی۔ سالِ تصنیف ۱۳۰۰ھ [۸۳ - ۱۸۸۲ء]۔ یہ مثنوی "تاریخ بلگرام" (مطبوعہ) میں شامل ہے۔ (ص ۱۳ تا ۳۰)۔ تعداد ابیات ۱۳۱۴۔ مصرع تاریخ:

معراج خیال مجلس آرائی
ھ ۱ ۳ ۰ ۰

مصنّف کا اصل مسودہ بھی کتب خانۂ بلگرامی میں محفوظ ہے۔

۱۸۔ مثنوی سفر سہسرام

اردو۔ قلمی۔ سالِ تصنیف ۱۳۰۰ھ [۱۸۸۳ء]۔ صفیر اسی سال سہسرام گئے تھے اور

وہاں ایک ہفتہ (۱۸ تا ۲۵ شعبان) قیام کیا تھا۔ اس میں سہسرام کے قیام کی تفصیلات ہیں۔
یہ مثنوی نامکمل ہے اور ۱۶۴ اشعروں پر مشتمل ہے۔

۱۹۔ مثنوی مائدہ الملقب بہ خوان لیغما

فارسی۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۳۰۱ھ [۸۴-۱۸۸۳ء] ۔ ص ۶۴۔ تعداد اشعار ۶۲۱۔
یہ شیخ بہاء الدین محمد آملی کی مثنوی "نان وحلوا" کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔

۲۰۔ مثنوی عبرت الناظرین

اردو۔ سالِ تصنیف ۱۳۰۵ھ [۸۸-۱۸۸۷ء] ۔ تعداد اشعار ۳۹۰۔ یہ مثنوی پہلی مرتبہ رسالہ "قومی زبان" کراچی کے دسمبر ۱۹۶۶ء اور جنوری ۱۹۶۷ء کے شماروں میں دو قسطوں میں شائع ہوئی تھی۔

۲۱۔ نادعلی

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء] ۔ ص ۴۰+۴۔ اس مجموعے میں ایک نعت اور چار منقبتیں ہیں۔ یہ پانچوں منظومات "میلاد معصومین" میں بھی شامل ہیں۔

۲۲۔ حسین بند

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء] ص ۴۳۔ یہ مخمس ۱۱۷ بندوں پر مشتمل ہے۔ اسے قدر بلگرامی کے "علی بند" کے ساتھ چھاپا گیا تھا۔ اس لیے مجموعے کا نام "علی بند قدر و حسین بند صفیر" ہے۔ (حیات، ص ۳۸-۱۳۶) یہ حسین بند "نادعلی" اور "میلاد معصومین" میں بھی شامل ہے۔

۲۳۔ مطالع الانوار

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۲۹۸ھ [۸۱-۱۸۸۰ء] ۔ ص ۳۶۔ اس میں مندرجہ ذیل چار منظومات شامل ہیں:

۱۔مخمس بر غزلِ ناسخ :

حبیب خدا کے گھر میں مختارِ جناں پیدا ہوا

۲۔مولود جناب امیر :

اے عندلیب خامہ نواسنجیاں سنا

۳۔مولود امام حسن :

زباں کو میری حدیثِ حسن سے کام رہا

۴۔مولود امام محمد تقی :

خوشی کیوں آج جامے میں نہیں پھولی سماتی ہے

یہ چاروں منظومات "میلادِ معصومین" میں شامل ہیں۔

۲۴۔ مسدس عید غدیر

اردو۔مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۳۰۱ھ [۸۴ - ۱۸۸۳ء] ۔تصنیف ۱۲۹۸ھ [۸۱-۱۸۸۰ء] ۔یہ مسدس "میلاد معصومین" میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس میں "مسدس مولود جناب امیر" بھی شامل ہے جس کا پہلا مصرع یہ ہے :

کعبہ کو جب خلیلِ خدا نے بنا کیا

دونوں کے مجموعی صفحات ۸ ۔

۲۵۔ تعویذ شفا

اردو ۔مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۳۰۲ھ [۸۵-۱۸۸۴ء] ۔ص ۴ ۔ یہ حضرت علیؓ کی منقبت ہے۔مصرع اوّل :

قسیم جنت و کوثر علی ابن ابی طالب

یہ منقبت "میلاد معصومین" میں بھی شامل ہے۔

۲۶۔ میلادِ معصومین

یہ صفیر کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے۔ حمد و نعت اور منقبت کا مجموعہ ہے جسے صفیر کے پوتے سیّد عنایت احمد بلگرامی نے مرتب کرکے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں عزیزی پریس آگرہ سے طبع کرایا تھا۔ اس میں "مطالع الانوار" اور "نادِ علی" کی تمام منظومات نیز "شبستان معراج" کو شامل کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۱۲ رباعیاں ہیں۔ پھر ۲۲۴ شعروں کا "قصیدہ در حمد باری تعالیٰ" ہے۔ بعدازاں بیس شعروں کی دو نعتیں اور مختلف عنوانات کے تحت ۸۰ منقبتیں ہیں۔

۲۷۔ ترجمۂ بوستانِ خیال

صفیر نے اپنی خود نوشت سوانحعمری میں "بوستانِ خیال" کے اردو ترجمے کی اٹھارہ جلدیں بتائی ہیں لیکن اس قصے کی پہلی جلد "صبحِ خنداں" کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"بعض احباب یہ سمجھتے ہیں کہ عاصی نے بوستانِ خیال کو انتخاب کیا ہے کہ اٹھارہ جلدوں کو دس جلدوں میں لکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ ایک جلد مسمّٰی بہ پردۂ اعظم اور افق الخیال ہے۔ اس میں شہزادے کے آبا و اجداد کا حال ہے۔ اس کے بعد یہ جلد 'صبحِ خنداں' اور 'پردۂ اوّل' ہے۔ یہاں سے شہزادے کا حال آغاز ہے اور تا بہ پردہ نہم کہ مسمّٰی بہ شامِ وصال ہے، اختتام ہے۔ اس حساب سے دس جلدیں ہوئیں۔" (ص ۱۱۵)

صفیر نے اپنے ترجمے کا نام "پرستانِ خیال" رکھا ہے۔ اس کی نو جلدیں ہیں۔ جن کو صفیر نے "پردہ ہائے پرستانِ خیال" کا نام دیا ہے۔ نو پردوں یا جلدوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ صبحِ خنداں
۲۔ چمنستان
۳۔ صبحِ بہار
۴۔ چشمۂ خضر
۵۔ حبابِ رعنا
۶۔ طلسمِ اعظم
۷۔ فروغِ نظر
۸۔ ساغرِ لبریز
۹۔ شامِ وصال

"افق الخیال" کو شامل کرنے سے جلدوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے۔

"افق الخیال" ۱۲۷۴ھ [۵۸-۱۸۵۷ء] میں لکھی گئی تھی۔ اس کا جو مسودہ کتب خانۂ بلگرامی میں محفوظ ہے وہ صرف پانچ صفحات پر مشتمل ہے اسے ایک علیحدہ جلد قرار دینا محل نظر ہے۔

پرستانِ خیال کا پردۂ اول یا جلد اوّل "صبح خنداں" اور جلد دوم "چمنستان" ۱۲۸۱ھ [۶۵-۱۸۶۴ء] میں مطبع عظیم المطابع عظیم آباد سے طبع ہو چکی ہیں۔ دونوں جلدوں کے جو نسخے کتب خانۂ بلگرامی میں ہیں، وہ ناقص الآخر ہیں۔ پہلی جلد ص ۶۱۶ تک اور دوسری ص ۹۲ تک ہے۔

"محشرستانِ خیال" میں صفیر نے لکھا ہے:

"اب مطبع عظیم المطابع ہے نہ بوستان خیال کا
چھپنا۔ صبح بہار چوتھی جلد شروع ہو کر پانچ جزو
چھپ کر ناتمام رہ گئی۔ قلّتِ فرصت اور مکروہاتِ
دنیا نے اور ہی عالم کر دیا ہے۔" (ص ۲۶)

صفیر نے تیسری جلد "صبح بہار" کو سہواً چوتھی جلد لکھ دیا ہے۔ مذکورہ اقتباس سے واضح ہے کہ تیسری جلد جزواً چھپی تھی اور باقی جلدوں کی طباعت نہیں ہوئی۔

کتب خانۂ بلگرامی میں پانچویں اور چھٹی جلدوں کے مسودات موجود ہیں۔ تیسری، چوتھی اور آخری تین جلدیں ضائع ہو چکی ہیں یا اگر کہیں موجود ہیں تو راقم کو ان کا علم نہیں۔ کتب خانۂ بلگرامی میں پانچویں جلد کے دو قلمی نسخے ہیں اور دونوں ناقص الآخر ہیں۔

۲۸۔ جوہر مقالات

صفیر نے اپنی تصانیف کی فہرست میں اس ناول کی تین جلدوں کا ذکر کیا ہے۔ اس کی صرف پہلی جلد دستیاب ہوئی ہے، بقیہ دونوں جلدوں کے لکھے جانے اور طبع ہونے کے بارے میں

کچھ علم نہیں۔ یہ ناول صفیر نے بقول خود " بطرز مراۃ العروس " لکھا ہے۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے اس کے صفحات ۱۴۰ بتائے ہیں۔ زمانۂ تصنیف و طباعت کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اس کا ذکر چونکہ صفیر کی مندرجہ بالا آپ بیتی میں ہے، اس لیے یہ ۱۲۸۷ھ [۷۱ - ۱۸۷۰ء] سے قبل کی تصنیف ہے۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی لکھتے ہیں "جوہر مقالات نذیر احمد کے اصلاحی ناولوں کا ایک کامیاب تتبع ہے اور اردو ناول نگاری کی راہ میں نذیر احمد کے بعد دوسرا ارتقائی قدم ہے۔" (حیات، ص ۱۱۵)

۲۹۔ مرغوب القلوب

فارسی، قلمی۔ اس کا مسودہ بخط مصنف کتب خانہ بلگرامی میں موجود ہے جو ۲۰۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا اختتام ۲۔ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ [۲۸ اپریل ۱۸۶۵ء] کو ہوا تھا۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا باب " درحقیقت و روایاتِ انبیا " ہے۔ دوسرا باب " در احوال چہاردہ معصومین " ہے۔ بقیہ ابواب میں اخلاقی حکایات اور پند و نصائح ہیں۔

۳۰۔ طبقات کرام سادات بلگرام

اردو، قلمی۔ یہ صفیر کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کے بارے میں انھوں نے ۱۲۹۸ھ [۸۱ - ۱۸۸۰ء] میں اپنے ایک بزرگ سید ابوالقاسم کے نام ایک خط لکھا تھا، جس میں اس کتاب کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے۔ اس خط کا ایک حصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

" اگرچہ پہلے اس کا نام ' نور التواریخ ' رکھا گیا تھا، مگر اب نام اس کا میں نے ' طبقات کرام سادات بلگرام ' رکھا ہے۔ کیونکہ کرام کے معنی بزرگوں کے ہیں، اور ترجمہ اس کا یہ ہوا کہ سادات بلگرام کے بزرگوں کے طبقے۔ اور ان طبقوں کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حال تک چودہ طبقوں پر سلسلہ سادات بلگرام کا قائم کیا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ایک مقدمہ اور تین باب اور ایک خاتمہ پر یہ کتاب مرتب

ہوئی ہے اور ہر باب کا ایک خاتمہ جدا ہے۔ بابِ تفصیل مقدمے میں مختصر جغرافیہ عالم اور مشرح جغرافیہ عرب و ہند جہاں سے سادات بلگرام کو تعلق زیادہ ہے، اور تین باب اس نظر سے لکھے گئے کہ عزت انسانی منحصر تین امروں پر ہے؛ اوّل شرافت، دوم جاہ و منزلت، سوم علم و فضیلت۔ اور یہ امور ساداتِ بلگرام میں بفضلہٖ تعالیٰ بدرجۂ احسن موجود ہیں۔ اس لیے اِس کتاب کے تین باب بایں تفصیل کیے گئے اور ہر باب کا خاتمہ مقرر کیا گیا۔

باب اوّل: بیان شرافت و نجابت سادات بلگرام۔ اس باب میں حضرت آدمؑ کے وقت سے سیّد ابو الفرح واسطی تک کا حال مختصر لکھ کر خاتمۂ باب میں نسب نامہ مکمل ساداتِ بلگرام کا لگا دیا گیا ہے۔ اور یہ سلسلہ بہتوں کا بھی سُنا گیا ہے جو سادات بلگرام کے سلسلے میں ہیں۔

باب دوم: بیان جاہ و منزلت سادات بلگرام میں۔ اس باب میں اوّل طبقات سلاطین قائم کر کے سیّد محمد صغریٰ کا بلگرام میں دخل لکھ کر اور سلسلہ وار سلاطین ہند کا مختصر ذکر کر کے محمد شاہ کے وقت میں سید محمد محسن والد ماجد نور الحسن خاں کا ذکر کر کے نور الحسن خان جنّت مکان کا ذکر مشرح انتقال تک لکھا گیا ہے اور اس باب کے خاتمے میں اوّل جغرافیہ بلگرام، بعد اُس کے اقوام و سکنائے بلگرام کی کیفیت جو آپ نے لکھی ہے یا اور لوگوں سے بہ تحقیق معلوم ہوئی ہے، مندرج کر کے سادات نامی کا حال سیّد محمد صغریٰ سے لے کر اپنے وقت تک مع مختصر سوانح عمری نور الحسن خان و خاندانِ نور الحسن خان و املاک و ریاست کا بیان مع احوالِ اولاد جو اُن کے ساتھ آئے تحریر ہوا ہے۔

باب سوم میں علما و فضلا و شعرائے بلگرام کا نام اور ان کی

تصنیفات یا اشعار عربی فارسی اردو ہندی لکھے گئے ہیں۔ اور اس کے خاتمے میں کچھ غدر کا حال مع کیفیت مختصر بلگرام و کوائف وآرہ در زمانۂ غدر۔ اور خاتمۂ کتاب میں ضلع شاہ آباد اور سکنائے ضلع شاہ آباد کی کیفیت اور اپنی سوانحعمری اور اپنے احباب کا حال تحریر کیا ہے۔ (مکتوبات قلمی' مرتبہ سیّد وصی احمد بلگرامی ص ۸۵-۱۸۴)

اس کتاب کا جو قلمی نسخہ بخطِ مصنف کتب خانۂ بلگرامی میں موجود ہے وہ ۵۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں شروع کے چھے طبقات جو حضرت آدم سے لے کر امام زین العابدین تک کے حالات پر مشتمل ہیں، موجود ہیں۔ اس کے بعد بلگرام کی تاریخ ہے۔ بعض عنوانات کے نیچے جگہیں خالی ہیں۔ بعض جگہ کئی کئی صفحات سادہ ہیں۔ بعض ابواب مکمل ہیں، بعض نامکمل۔ آخر میں کچھ تقریظیں ہیں۔ تقریظوں سے قبل ۸۲ صفحات سادہ ہیں۔ شاید یہ صفحات تیسرے باب (علما، فضلا اور شعرا سے متعلق) کے لیے مخصوص کیے گئے تھے جو اس مسودے میں موجود نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصنف کا مسودۂ اوّل ہے۔ یہ کتاب ۱۲۹۹ھ [۸۲-۱۸۸۱ء] میں مکمل ہوئی۔
(یادداشت قلمی نوشتہ سیّد وصی احمد بلگرامی)

۳۱ - تاریخ بلگرام
اردو۔ "طبقات کرام سادات بلگرام" کی ترتیب بعد میں صفیر نے بدل دی اور اس کا پہلا حصہ "تاریخ بلگرام" کے نام سے ۱۳۰۱ھ [۸۴-۱۸۸۳ء] میں شائع کیا۔ کتب خانۂ بلگرامی میں جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ ناقص الآخر ہے اور ص ۱۰۳ تک ہے۔ اس لیے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کتاب کس مطبع میں طبع ہوئی۔ یہ دراصل بلگرام کی ثقافتی تاریخ ہے۔ ابتدائی پچاس صفحات میں بلگرام کی وجہ تسمیہ، محلوں، آبادی اور پھلوں وغیرہ کے بارے میں معلومات درج کی ہیں اور پھر بلگرام کی رسموں، میلوں اور دیگر تقریبات کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

اس جلد میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ "طبقات کرام سادات بلگرام" کے مسودے میں نہیں ہے اور مسودے میں جو کچھ ہے، اس کا کوئی حصہ اس جلد میں درج نہیں ہوا۔ اسی لیے

یہاں اسے ایک علحدہ تصنیف قرار دیا گیا ہے ۔

۳۲ ۔ حیات سید نور الحسن خان بلگرامی

اردو ۔ قلمی ۔ سالِ تصنیف ۱۳۰۰ھ [۸۳ - ۱۸۸۲ء] ۔ ص ۱۳۲ ۔ صفیر نے "طبقات کرام سادات بلگرام" کے ا
سید نور الحسن خان کے جو حالات لکھے تھے، وہ اس قدر تفصیل سے بیان ہونے کہ علحدہ
کتاب کی صورت اختیار کر گئے ۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں ؛

اول ۔ ص ۱ تا ۶۷ ۔ "در احوال سید نور الحسن خاں بہادر در ملک مغرب از وقت
محمد شاہ بادشاہ تا جنگ بکسر و سکونت ضلع شاہ آباد ۔"

دوم ۔ ص ۶۸ تا ۱۳۲ ۔ "در احوال سید نور الحسن بہادر در ملکِ مشرق من ابتدائے
عہد سلطنت انگلشیہ کہ بعد جنگ بکسر واقع شد تا
وقت انتقال ۔"

۳۳ ۔ قطعات ترقی

اردو ۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ، ۱۸۷۴ء [۹۱ - ۱۲۹۰ھ] ۔ ص ۸ ۔ اس رسالے میں صفیر نے
"نثری فقروں کے ذریعے تاریخیں نکالی ہیں ۔" (حیات، ص ۳۶ - ۱۳۵)

۳۴ ۔ انشائے سیدِ گل

اردو ۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ ۔ مرتبہ سید محمد ہاشم ۔ اس مجموعے میں صفیر کے نام ان کے بزرگوں،
استادوں، دوستوں اور شاگردوں کے خطوط ہیں ۔ چونکہ اس میں صفیر کے خطوط بھی ہیں، اس لیے
اسے صفیر کی تصانیف میں شمار کیا گیا ہے ۔ کتاب کے مندرجات کی تفصیل آیندہ اوراق میں کہیں
درج کی گئی ہے ۔

۳۵ ۔ تبسمِ گل

اردو ۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ، ۱۲۹۳ھ [۷۷ - ۱۸۷۶ء] ۔ صفیر نے اپنے شاگرد
سید احمد حسین احمد کی شادی کا رقعہ منظوم (فارسی) لکھا تھا ۔ اس رقعے پر شاد عظیم آبادی نے

بعض اعتراض کیے تھے۔ "تبسم گل" میں انھیں اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ اس رسالے پر صفیر کے شاگرد باقر حسین باقر کا نام بہ حیثیت مرتب دیا گیا ہے۔ لیکن یہ صفیر ہی کی تصنیف ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے آخر میں صفیر کا باون شعروں کا ایک "قطعۂ فخریۂ شاعرانہ" (فارسی) بھی شامل ہے جو اسی زمین میں ہے جس میں رقعۂ شادی لکھا گیا تھا۔ (قلمی یادداشت بابت تصانیف صفیر از سید وصی احمد بلگرامی)

۳۶۔ رسالہ جواب کافی

اردو۔ تصنیف ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء]۔ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے اور مطبوعہ نسخے کا ذکر صفیر نے "اظہار الاسرار" (ص ۱۴) میں کیا ہے۔ یہ بیاض صفیر میں بھی شامل ہے۔ (ص ۱۳۸-۹۵)۔ شعبان ۱۲۹۶ھ میں "علی بند" مصنفہ قدر بلگرامی اور "حسین بند" مصنفہ صفیر یک جا طبع ہوئے تھے اور شاد عظیم آبادی کو تحفۃً بھیجے گئے تھے۔ شاد نے ایک منقبت "حلیۃ النور" لکھی اور اس میں قدر و صفیر پر اعتراضات کیے۔ سید احمد حسین احمد شاگرد صفیر نے ایک منقبت "جوشنین" لکھی اور اس کے حاشیے پر "حلیۃ النور" کی غلطیاں دکھائیں۔ اس کا جواب شیخ علی باقر شاگرد شاد نے "جواب شافی" کے نام سے دیا۔ رسالہ "جواب کافی" اسی "جواب شافی" کا جواب ہے۔

۳۷۔ نمیقہ محبت وثیقہ

اردو۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء] ص ۳۲۔ "مرقع فیض" کی اشاعت کے بعد شاد عظیم آبادی نے صفیر کو ایک خط لکھا تھا۔ یہ رسالہ اسی خط کا جواب ہے۔

۳۸۔ اظہار الاسرار

اردو۔ مطبوعہ مطبع نور الانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء]۔ ص ۲۸۔ اس کا پورا نام "ضمیمہ مخبر اخلاص قدیمہ الموسوم بہ اظہار الاسرار متعلق بہ نمیقہ محبت وثیقہ صفیر" ہے۔ اس میں صفیر نے شاد کو اپنا شاگرد ثابت کرنے سے متعلق تمام واقعات بیان کیے ہیں اور "شاہدین

عادلین" کی تحریری شہادتیں بھی پیش کی ہیں۔

۳۹۔ محشرستانِ خیال

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء]۔ ص ۸۸۔ اس کتاب کی تفصیل آیندہ صفحات میں ایک الگ باب میں پیش کی گئی ہے۔

۴۰۔ ضمیمہ محشرستانِ خیال

اردو۔ مطبوعہ مطبع نورالانوار آرہ، ۱۰ شوال ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۸۸۰ء ص ۱۰۔ اس کا پورا نام یہ ہے:

"ضمیمہ محشرستانِ خیال حصہ اول المسمّٰی بہ تہذیب المقال صفیر در اصلاح وضع توضیح المقال آزاد"۔

"محشرستانِ خیال" کی اشاعت کے بعد خواجہ فخرالدین حسین سخنؔ کے شاگرد سردار مرزا آزاد نے "توضیح المقال فی شرح محشرستانِ خیال" کے نام سے ۴۸ صفحات کا ایک رسالہ لکھا جو مطبع صبح صادق پٹنہ میں طبع ہوا۔ اس پر سنہ طباعت درج نہیں۔ لیکن گمانِ غالب ہے کہ یہ ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوا ہو۔ آزاد نے طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں صفیر کے بیانات کی کہیں تردید کی ہے اور کہیں مذاق اڑایا ہے۔ صفیر نے عالمِ خیال میں ایک محفلِ مشاعرہ منعقد کی تھی، آزاد کو اصرار ہے کہ وُہ بھی اس محفل میں شریک تھے۔ آزاد نے اپنی شرکت کا ذکر دلچسپ انداز میں کیا ہے۔ "ضمیمہ محشرستانِ خیال" آزاد کے رسالے کا جواب ہے۔

۴۱۔ رشحاتِ صفیر

صفیر نے اپنی خودنوشت میں "مجموعۂ فیضِ صفیر در علمِ شعر" کی اکیس جلدوں کا ذکر کیا ہے۔ "فیضِ صفیر" تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۷۰ھ [۵۴-۱۸۵۳ء] برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام "باعتبارِ آغازِ تسوید" ہے۔ "رشحاتِ صفیر" فیضِ صفیر کا ساتواں حصّہ ہے۔ اور یہ نام بھی تاریخی ہے جس سے ۱۲۸۹ھ [۷۳-۱۸۷۲ء] برآمد ہوتا ہے۔ یہ نام اُس وقت رکھا گیا تھا

جب مذکورہ سنہ میں اس کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا تھا۔ رشحات کا سالِ تصنیف ۱۲۸۰ھ [۶۴-۱۸۶۳ء] ہے۔ اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کتاب کا مسودہ غالب کی نظر سے گزرا تھا اور انھوں نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔

رشحات کے مکمل متن کی اشاعت سے پہلے ۱۲۷۸ھ [۶۲-۱۸۶۱ء] میں اس کا خلاصہ "خلاصۂ فیضِ صفیر" کے نام سے مطبع چشمۂ علم پٹنہ سے طبع ہوا تھا۔ یہی خلاصہ دوبارہ صفیر کے پوتے سید عنایت احمد بلگرامی نے ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء میں رفاہِ عام اسٹیم پریس لاہور سے طبع کرایا تھا۔

یہ کتاب اردو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے بارے میں ہے اور اپنے موضوع پر پہلی تصنیف ہے۔

"فیضِ صفیر" کا صرف ساتواں حصہ ہی طبع ہوا ہے۔ باقی حصوں کے طبع ہونے کا تو کیا، سوائے ایک کے، لکھے جانے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ۱۲۹۳ھ [۷۷-۱۸۷۶ء] میں "رشحاتِ صفیر" کا جو ایڈیشن مطبع نور الانوار آرہ سے طبع ہوا تھا، اس کے آخری صفحے پر اردو محاورات سے متعلق کتاب "ارمغانِ صفیر" کی طباعت شروع ہونے کی اطلاع ملتی ہے۔ اس اطلاع میں "ارمغانِ صفیر" کو "فیضِ صفیر" کا حصہ ششم بتایا گیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس کی طباعت مکمل نہیں ہوئی اور یہ حصہ کبھی منظرِ عام پر نہیں آیا۔ اس کا مسودہ بھی کہیں موجود نہیں ہے۔

۴۲۔ مختصر رسالہ قوافی

اردو۔ قلمی۔ تصنیف ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء]۔ یہ رسالہ بیاضِ صفیر (ص ۳۹-۵۲) میں شامل ہے۔

۴۳۔ رسالۂ خاص

اردو۔ قلمی۔ تصنیف ۱۲۹۶ھ [۷۹-۱۸۷۸ء]۔ یہ بھی بیاضِ صفیر (ص ۴۵-۵۱) میں شامل ہے۔ یہ دراصل خواجہ فخر الدین سخن کے نام ایک خط ہے جس میں تنبیہ صفیر بلگرامی کے

بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ صفیرؔ نے سخن کو یہ اطلاع بھی دی ہے کہ پانچ تفصیلی جوابات بنام (۱) سلسلۂ سخن (۲) دفعِ تحیّر (۳) رفعِ تبختر (۴) چوب معلّم اور (۵) معیار فخر الدین زیر طبع ہیں۔ معلوم نہیں یہ جوابات طبع ہوئے یا نہیں۔

۴۴۔ تذکرۂ جلوۂ خضر

یہ صفیرؔ کی مشہور و مقبول تصنیف ہے۔ صفیرؔ کی تمام شہرت کا دارو مدار اسی تذکرے اور "رشحاتِ صفیر" پر ہے۔ تذکرے کی پہلی جلد مطبع نور الانوار آرہ سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء میں طبع ہوئی تھی۔ ص ۳۰۸۔ اس کے سرورق پر یہ وضاحت کی گئی ہے "جلد اول نظم اردو منجملہ سہ جلد حصہ اول . . . . منتعلق کیفیت زبان شعرائے زبان دہلی" اس حصہ اول کی دوسری جلد مذکورہ مطبع ہی سے ۱۳۰۷ھ/۱۸۹۰ء میں طبع ہوئی جو "تاریخ نظم اردو و تذکرۂ شعرائے خاص زبانِ لکھنؤ و فرق محاورات دہلی و لکھنؤ" پر مشتمل ہے۔ ص ۴۸۴۔ اِس جلد کے آخر میں صفیرؔ نے اپنے نام کے ساتھ ۷ رمضان ۱۳۰۷ھ کی تاریخ درج کی ہے۔ اسی سال اور اسی مہینے کی ۲۲ویں تاریخ کو صفیرؔ کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے یہ تذکرہ مصنّف کے منصوبے کے مطابق مکمل نہ ہو سکا۔

۴۵۔ ابعادِ ثلاثہ

اردو۔ قلمی۔ تصنیف ۱۳۰۶ھ [۸۹-۱۸۸۸ء]۔ ص ۶۹۔ اس میں دہلی، لکھنؤ اور پورب کی اردو کا فرق دکھایا گیا ہے۔

۴۶۔ تصدیق الایمان

اردو۔ قلمی۔ ص ۵۳۵۔ یہ ضخیم کتاب پادری عماد الدین کی تصنیف "تحقیق الایمان" کے جواب میں ہے۔ صفیرؔ نے اسے ۱۵ جنوری ۱۸۸۸ء [یکم جمادی الاول ۱۳۰۵ھ] کو شروع کیا اور اسی سال مارچ کے آغاز میں مکمل کر لیا۔ اتنی ضخیم کتاب کو دو مہینے سے کم کی مدت میں تصنیف کرنے سے صفیرؔ کی زود نویسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتب خانۂ بلگرامی میں اس کتاب کا مسودہ (بخط مصنّف) موجود ہے۔ اور یہ نامکمل ہے۔

۴۷۔ تبصرہ بر کتاب المامون

اُردو۔ قلمی۔ ص۰۰۸۔ علامہ شبلی نعمانی کی کتاب "المامون" پر صفیر نے رمضان ۱۳۰۶ھ [مئی ۱۸۸۹ء] میں تبصرہ لکھنا شروع کیا تھا جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکا۔

صفیر شاعر ہی نہیں، شاعر گر بھی تھے۔ اُن کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جن کے شاگردوں کا تذکرہ بھی شائع ہُوا ہے۔ یہ تذکرہ اُن کے ایک شاگرد سلطان مرزا سلطان نے "مرقع فیض" کے نام سے لکھا تھا اور جو ۱۲۹۵ھ [۱۸۷۸ء] میں مطبع نور الانوار آرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس میں اکسٹھ شاگردوں کے حالات ہیں۔ شاد عظیم آبادی اور خواجہ فخر الدین حسین سخن کے حالات بھی اس میں ہیں۔ یہ دونوں بعد میں صفیر کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے۔ "مرقع فیض" کی اشاعت کے بعد بھی صفیر کے شاگردوں میں اضافہ ہوا۔

صفیر کا انتقال ۲۲ رمضان ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۹۰ء کو عظیم آباد میں ہوا۔ تدفین آرہ میں ہُوئی۔

غالب و صفیر کی مراسلت

صفیر کا شمار غالب کے نامور تلامذہ میں ہوتا ہے ، انھیں اپنے استاد پر بے حد فخر و ناز تھا۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے غالب کا ذکر نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ صفیر اور غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ سے ہوتا ہے جب صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی تھی۔ ۱۲۸۱ھ تک صفیر و غالب میں خط و کتابت رہی۔ ۱۲۸۲ھ کے شروع میں صفیر دہلی گئے اور وہاں دو ڈھائی مہینے قیام کیا۔ اس مدت میں انھیں غالب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔

صفیر کے نام غالب کے تمام خطوط صفیر کی زندگی ہی میں شائع ہوئے۔ پہلی مرتبہ "انشائے سبدگل" (۱۲۸۹ھ) میں۔ دوسری مرتبہ "مرقع فیض" (۱۲۹۵ھ) میں اور تیسری مرتبہ "جلوۂ خضر" جلد دوم (۱۳۰۲ھ) میں۔ تینوں جگہ یہ خطوط مکمل صورت میں یا تمام خطوط کسی ایک کتاب میں موجود نہیں ہیں۔ مذکورہ تینوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر میں نے مکاتیب غالب کے جو متون تیار کیے ہیں، وہ اُن متون سے مختلف ہیں جو مختلف رسائل اور مجموعہ ہائے مکاتیب غالب میں شامل ہیں۔ ۱۱

"انشائے سبدگل" خطوط کا مجموعہ ہے جسے صفیر کے شاگرد سید محمد ہاشم نے مرتب کیا۔ ۱۲۸۹ھ میں مطبع نور الانوار آرہ سے یہ مجموعہ چھپنا شروع ہوا لیکن چند جزو چھپنے کے بعد نامکمل رہ گیا۔ اس کے دیباچے میں مرتب نے لکھا ہے کہ یہ کتاب تین فصلوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہوگی۔ پہلی فصل میں صفیر کے بزرگوں اور استادوں کے خطوط ہوں گے ، دوسری میں دوستوں کے اور تیسری

یں شاگردوں کے ۔ خاتمے میں اُن لوگوں کے حالات ہوں گے جن کا ذکر ان خطوط میں آیا ہے ، نیز ان لوگوں کا احوال ہوگا جن کے نام صفیر کے خطوط لکھے گئے ۔ نامکمل " انشاے سبدگل " کا اب صرف ایک ہی نسخہ موجود ہے جو سیّد وصی احمد بلگرامی مرحوم کے کتب خانے میں ہے ۔ اس کا کوئی دُوسرا نسخہ کسی فرد کے پاس یا کسی کتب خانے میں نہیں ہے ۔ یہ صفحہ اول سے صفحہ ۵۲ تک ہے اور درمیان میں سے سولہ[1] صفحات یا تو موجود نہیں ، یا ہیں تو وہ سادہ ہیں ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اجزا صرف ایک ہی طرف سے چھپ کر رہ گئے ۔ پہلی دو فصلوں کے بیشتر خطوط ان صفحات میں آ گئے ہیں ، تیسری فصل صفحہ ۴۸ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے صرف تین صفحات موجود ہیں (صفحہ ۵۰ و صفحہ ۵۱ خالی ہیں) ۔ تیسری فصل چونکہ شاگردوں کے خطوط پر مشتمل ہے ، اس لیے ممکن ہے کہ شاگردوں کے نام صفیر کے خطوط اور ان کے جوابات فراہم نہ ہو سکے ہوں اور یُوں یہ کتاب نامکمل رہ گئی ہو ۔

" انشاے سبدگل " کی ترتیب و اشاعت میں خود صفیر بلگرامی کی کوششوں کو دخل تھا ۔ وُہ اپنے ایک شاگرد جوشش منیری کے نام لکھتے ہیں :

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالفعل رقعات خود کہ بنام احباب و بزرگان و اعزّہ نوشتہ ام مع جواب آں کہ از طرف انہا آمدہ ، طبع می کنم ۔ و اعانت آں از چند تلامذۂ بندہ شد ۔" (مکتوب قلمی ، کتب خانۂ بلگرامی)

جوشش منیری نے اس کا جو جواب دیا وہ " مرقع فیض " میں چھپ چکا ہے اور اس میں " انشاے سبدگل " کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :

" کچھ غزل و قطعہ و رباعی بہ ذریعہ عریضہ کے ارسال کرتا ہُوں ؛ امید ہے کہ پہلے اصلاح فرما کر جس قدر مناسب سمجھا جائے ، داخل انشاء سبدگل فرمایا جائے ۔"
(مرقع فیض ، ص ۲۵)

---

[1] یہ صفحات موجود نہیں یا ہیں تو سادہ ہیں : ۹ تا ۱۲ ، ۲۲ ، ۲۳ ، ۲۶ ، ۲۷ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۴ ، ۳۵ ، ۴۶ ، ۴۷ ، ۵۰ ، ۵۱ ۔

"انشائے سبد گل" کی پہلی فصل میں غالب کے خطوط مع جوابات صفیر موجود ہیں۔

"مرقع فیض" دوسری کتاب ہے جس میں خطوطِ غالب بنام صفیر ملتے ہیں۔ یہ صفیر کے تلامذہ کا تذکرہ ہے جسے صفیر کے ایک شاگرد نواب تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا سلطان نے لکھا تھا۔ یہ تذکرہ ۱۲۹۵ھ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے خاتمے میں صفیر کے حالات ہیں۔ اسی ضمن میں غالب کے خطوط بھی شامل کر دیے گئے جن کی تمہید یہ ہے:

"۔۔۔ چوں کہ آپ [صفیر] کے جوہر طبع کا فروغ اساتذہ پسند ہے، اس واسطے چند فقرات، جو حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمۃ نے آپ کی شان میں تحریر فرمائے ہیں، بطور اسناد کے لکھے جاتے ہیں۔" (ص ۸۲)

خطوطِ غالب کا تیسرا ماخذ "جلوۂ خضر" جلد دوم ہے اس میں ایک جگہ صفیر نے اپنے استادوں کا ذکر کیا ہے۔ غالب کا ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے:

"۔۔۔۔۔ نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ، غالب تخلص، عرف مرزا نوشہ۔ میں نے حضرت غالب کی ملازمت اور شاگردی کی کیفیت جلد اوّل تذکرہ ہٰذا صفحہ ۲۲۱ میں لکھ دی ہے۔ اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مگر اتنا لکھنا ضرور ہے کہ ۱۲۸۲ھ میں محرم کے آخر مہینے میں میں حضرت غالب کی ملازمت کے لیے دہلی گیا اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ کچھ کیفیت اس کی جلد اوّل صفحۂ مذکور میں لکھی ہے۔ اصلاح کی کیفیت یہ تھی کہ حضرت شاگرد کا کلام خود اپنی چشم مبارک سے دیکھ کر اپنے ہاتھوں سے اصلاح دیتے تھے۔ چناں چہ رسالۂ 'فیض صفیر' جو تانیث و تذکیر کے باب میں ہے، حضرت نے کئی روزوں میں خود اپنی آنکھ سے ملاحظہ فرمایا اور جابجا اصلاح دی اور اس کی تقریظ لکھی جو "عود ہندی" میں چھپی ہے اور کلام فارسی و اردو کی اصلاح بھی اکثر ہوا کی ہے۔" (ص ۲۱۶)

اس کے بعد صفیر نے اپنے اصلاح شدہ کلام کے ساتھ غالب کے

خطوط بھی نقل کیے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، صفیر و غالب کے تعلقات کا آغاز ۱۲۸۰ھ میں ہوتا ہے، جب صفیر نے غالب سے شاگردی کی درخواست کی تھی۔ ۱۲۸۰ھ میں صفیر اپنے ناناصاحب عالم مارہروی کے پاس مارہرہ میں مقیم تھے، وہیں سے انھوں نے غالب کو ایک خط (فارسی میں) لکھا جس پر صاحبِ عالم مارہروی اور شاہ عالم مارہروی کی سفارشی تحریریں تھیں۔ اس سے قبل کہ اس مراسلے کا متن پیش کیا جائے، یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صفیر بلگرامی کا غالب کے نام ایک اردو مکتوب بھی ملتا ہے جس میں شاگرد بننے کی درخواست کی گئی ہے۔ یہ مکتوب "انشائے سبدگل" (ص ۱۳) میں ہے اور اس کا متن یہ ہے:

مکتوبِ صفیر بنام غالب (۱)

"جناب معلیٰ القاب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ مدظلہ۔
سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نبیرۂ حضرت سید صاحب عالم صاحب و قبلہ مدظلہ
کہ نادیدہ اشتیاق حضوری اور آرزوے قدم بوسی رکھتا ہے، بوسیلۂ تحریر پُر تاثیر
جناب ناناصاحب و قبلہ مدظلہ سلکِ شاگردانِ خاص میں منسلک ہوا چاہتا ہے۔ مجھے
زیادہ لکھنے کی حاجت نہیں کہ میرا وسیلہ بڑا ہے۔ ایک مخمس غزل قدسی کا نعت میں جو
بالفعل کہا ہے، ملفوف ہے، والتسلیم۔"

اس خط پر تاریخ درج نہیں۔ "انشائے سبدگل" میں اس کے بعد غالب کا "جوابی مکتوب" ہے۔ یہ "جوابی مکتوب" وہی ہے جو غالب نے مثنوی "صبح امید" پر اصلاح دینے کے بعد لکھا تھا۔ مرتب "انشائے سبدگل" نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے اس خط کو صفیر کے مندرجہ بالا خط کا جواب سمجھا۔ صفیر نے اپنے مذکورہ خط میں سید صاحب عالم مارہروی کی سفارشی تحریر کا ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ تحریر تو درج ذیل فارسی خط کے ساتھ بھیجی گئی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ صفیر نے غالب کے نام پہلے اردو میں خط لکھا ہو، پھر اسے مسترد کرکے فارسی میں تحریر کیا ہو۔ اردو خط کا مسودہ ان کے کاغذات میں پڑا رہا ہوگا، جسے بعد میں "انشائے سبدگل" میں شامل کر لیا گیا۔

صفیر نے مارہرہ سے غالب کے نام جو خط لکھا تھا وہ "جلوۂ خضر" (جلد دوم) میں شامل ہے اور اس کا متن یہ ہے[1]:

مکتوب صفیر بنام غالب (۲)

"یزدان را از زبان بے زبانی سپاس گویم کہ آرزوے دیرینۂ ما را بچہ عنوان برآورد و مرا بہ معرض پا بوسی بزرگان بسر در آورد ۔ سیّما حضوری جناب نانا صاحب و قبلہ حضرت مولوی سیّد صاحب عالم صاحب دام ظلہٗ را جاں دار دے دل درد آشنا ساخت ۔ و از قصبۂ آرہ ضلع شاہ آباد کہ از عظیم آباد پٹنہ شانزدہ کروہ سمت مغرب است و بزرگانم بحیلۂ ریاست در آنجا طرح اقامت ریختہ اند تا قصبۂ مارہرہ کہ مولدم و مسکن جدم است، کشاں کشاں آورد ۔

اے خدا قربان احسانت شوم
ایں چہ احسان است قربانت شوم

در آب و گل ایں بیدل کہ نمک مذاق ریختہ اند و شور سودا از سر برانگیختہ از بدو شعور ہم بہ ارث آبائی و ہم بہنجار طبع آزمائی با غزل سرائی سرے دارد۔ و مہما امکن انچہ از دُر و خزف می یابد از بحر خیال بیروں می آرد۔ اما ایں شاہدے است شوخ و شنگ کہ در کنار کسان بمشکل جا گرم می کند۔ نہ کہ چوں من ناکس ہوش در سر دارد ۔ ایں ہم خوبی تقدیر اوست ۔ چہ کند مجبور است کہ افسونے چند از کلام بزرگان خصوصاً جناب غالب معجز بیان یاد دارم ۔ بہزار حیلہ تا لب آغوش بیان می آرم ۔ زیادہ ازیں عرصۂ مجال تنگ و حوصلہ فراخ ہنوز در کنار گرفتن باقی است ۔ و حصول

---

[1] خط کا عنوان یہ ہے "عریضہ کہ بندہ صفیر بلگرامی نے قبل شاگردی کے مارہرہ ضلع ایٹہ سے ۱۲۸۰ھ میں حضرت غالب کی خدمت میں روانہ کیا تھا۔"

ایں مدعا دشوار تا کہ رشک نظیری و کلیم و غیرت صائب و سلیم ، ظہوری ہنجار ، نظامی کردار ، مطلوب ہر طالب جناب نجم الدولہ ، دبیر الملک ، نواب اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ متخلص بہ غالب دام ظلہ افسونے تازہ نہ برانگیزد و بہ رہنمائی ایں نابلد کوہ (کوچہ ؟) خوش کلامی بندہ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی نہ برخیزد ۔ اگرچہ جائے آن بود کہ سر را منصب پا دادہ و پا بر دوش استعجال نہادہ بدہلی رسیدمے و از گلزار زیارت حضرت غالب علیٰ کل غالب گل نظارہ برچیدمے ، و نالہ ہائے چند کہ از دل غم پیوند سرزدہ اند بگوش حق نیوش رسانیدمے و از خوبی قسمت دیدمے انچہ دیدمے ، اما دام "کل امر مرہون باوقاتہ" چنانم نہ بستہ کہ ایں راہ بر رویم کشاید ۔ کام بخشِ جہانیاں منِ ناکام را روزی و نصیب فرماید ۔ حالا بوسیلۂ دو بزرگان باطناً خود را بحضور عالی می رسانم ۔ یکے نانا صاحب ، دومی جناب خال فرخ فال حضرت شاہ عالم صاحب ، بو کہ نظر توجہ دریغ نہ شود ۔

از بزرگاں کار ہا دشوار نیست

و بنا بر اظہار بے استطاعتی خود غزلے چند فارسی و اردو می رسد ، بامعان نظر دیدہ ایں انگارہ را از رنگ اصلاح جلوہ تازہ دادہ شود ، و بعد ازیں نام ایں گمنام در زمرۂ مستفیدان نگاشتہ آید کہ سر افتخارم بر فلک ساید ۔ فقط

و پرسیدنی ہم دارم و آں لفظ 'پرستان' است ۔ بعضے گویند کہ ایں لفظ ہندی است پری استھان ، چہ استھان مقام را گویند ۔ و بعضے بر آنند کہ استھان ہندی و پری فارسی ، ترکیب آں چگونہ واقع است ۔ در اصل پریستان است ۔ یای پری تخفیف کردہ شد

و رائے پری را کسرِ دادہ پرستان کردند۔ حالا از جناب اصل حقیقت می پرسم"۔ (ص ۱۷-۲۱۶)

اس خط پر صاحبِ عالم مارہروی نے مندرجہ ذیل سفارشی سطور تحریر کیں:

"صاحب عالم غفر اللہ الاعظم سلام و دعا با آرزومندی ہائے بے حد و انتہا می رساند و ایں دو بیت حالیہ می خواند:

'اے لعل ز اشعار تو شرمندہ گہر ہم
مشتاق تو اربابِ دول، اہلِ ہنر ہم
لختِ جگرم را کہ صفیر است تخلص
خواہد ز تو فیض سخن آں لختِ جگر ہم

والسلام"[1]

شاہ عالم نے مندرجہ ذیل سفارشی الفاظ لکھے:

". . . . . چہ عجب[2]
ما بندۂ لطف تو و احسان توئیم

---

[1] یہ خط بھی "جلوۂ خضر" (جلد دوم، ص ۲۱۹) میں ہے۔ لفظ "والسلام" "جلوۂ خضر" میں نہیں ہے بلکہ خط کے اصل مسودے سے لیا گیا ہے جو کتب خانۂ بلگرامی میں ہے۔ یہ ۱۳ × ۹" تقطیع کا کاغذ ہے جس کے ایک طرف صفیر کا خط ہے۔ خط کے دائیں حاشیے پر صاحبِ عالم کی اور بائیں حاشیے پر شاہ عالم صاحب کی تحریر ہے۔ صفیر نے شاہ عالم کی تحریر "جلوۂ خضر" میں نقل نہیں کی۔ یہ پہلی مرتبہ یہاں شائع ہو رہی ہے۔ اس خط کی دوسری طرف صفیر کا کلام ہے۔ غالب نے اسی پر اصلاح دے کر یہ کاغذ صفیر کو واپس کر دیا۔ صاحبِ عالم مارہروی کا خط عبدالغفور سرور کے قلم سے ہے کیونکہ وہ بدخطی کی وجہ سے اپنے خطوط سرور سے لکھواتے تھے اور صرف دستخط کر دیتے تھے۔ اس طرح اس نادر دستاویز پر پانچ اہلِ علم (غالب، صاحبِ عالم، شاہ عالم، سرور اور صفیر) کی تحریریں موجود ہیں۔

[2] اس اقتباس میں جہاں کہیں نقطے لگائے گئے ہیں، وہاں سے اصل مکتوب کرم خوردہ ہے۔

بحضور شفقت گنجور جناب مرزا صاحب قبلہ و کعبہ محمد اسد اللہ خان صاحب مدظلہ العالی۔ بندہ شاہ عالم غفر اللہ الاعظم کہ نیاز مند قدیم ہے ، بعد گزارش تسلیم و بندگی ..... عزیز ہمشیر زادۂ بندہ سید فرزند احمد صاحب متخلص بہ صفیر کہ فی الحال بہ تقریب ملازمت حضرت والد ماجد مدظلہ العالی وارد مارہرہ ہیں ، اشتیاقِ قدم بوسِ جناب بہت رکھتے ہیں ، اور جو محبت اور اخلاص آپ کا نسبت والد صاحب کے اور عطوفت روز افزوں جناب کی اوپر حال میرے کے یوماً فیوماً زیادہ جانتے ہیں ..... ہم بھی وابستگانِ دامنِ محبتِ جناب .... امید کہ حضور پُر نور نظر کیمیا اثر سے ملاحظہ فرما کے حک و اصلاح سے کلام عزیز مذکور درست فرما دیں .....“

صفیر نے اپنے مکتوب کے ساتھ غالب کو دو فارسی کی اور دو اُردو کی غزلیں ارسال کی تھیں ۔ غالب نے صفیر کے فارسی خط اور فارسی غزلوں پہ اصلاح دی ۔ فارسی خط پر جو اصلاح دی ، وہ خط پہ درج کی اور اپنے مکتوب میں اس کی تفصیل لکھی ۔ اشعار پہ جو اصلاحیں دیں ، وہ یہ ہیں :

۱۔ خیال روے تو اے قبلۂ نظر کردم
زدیدنت نظرِ خویش بہرہ ور کردم

اس شعر کا پہلا مصرع یُوں بنا دیا :

خیال روے ترا قبلۂ نظر کردم

۲۔ بلند شد شب ہجراں چو شعلۂ آہم
چراغ ماہ خمش گشتہ بود بر کردم

دُوسرے مصرعے کی اصلاحی صورت یہ ہوگئی :

چراغ مہ بہ فلک مردہ بود بر کردم

مندرجہ ذیل تین اشعار غالب نے قلم زد کر دیے۔ یہ شعر صفیر نے "جلوۂ خضر" میں درج نہیں کیے۔ قلمی مکتوب سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

خوش است جامہ دربدن و دیدنِ صحرا
زفیض دست جنوں کسب ایں ہنر کردم

خضر مصاحبتم در سفر تمنّا داشت
ولے نہ باخودش از رشک ہم سفر کردم

بجائے خود بنشیں، پا منہ بجائے دگر
بیا کہ جائے تو دل کردم و جگر کردم

صفیر نے دونوں غزلوں کے مقطعوں میں غالب کا ذکر کیا ہے:

برائے حضرت غالب ز فرط شوق صفیر
ترانۂ غزلِ شابقانہ سر کردم

ز طور مشعل اشعار غالب است صفیر
چراغ این غزل فارسی کہ بر کردم

اردو کی جو دو غزلیں صفیر نے غالب کو بھیجی تھیں، ان میں سے ایک جس کا مطلع یہ ہے:

اے فلک روز جو بیچاں ہیں ہم
کیا خمِ کاکلِ خوباں ہیں ہم

صفیر نے "جلوۂ خضر" میں درج کی ہے، لیکن دُوسری غزل درج نہیں جس کا مطلع یہ ہے:

زلف کو ہم بلا سمجھتے ہیں
پیچ کی بات کیا سمجھتے ہیں

یہ دونوں غزلیں پانچ پانچ شعروں کی ہیں۔

اصلاحوں کے ساتھ غالب نے صفیرؔ کے خط کا جو جواب لکھا وہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ یہ خط پہلی مرتبہ "مرقع فیض" (ص ۸۲) میں جزوی طور پر چھپا اور دوسری مرتبہ "جلوۂ خضر" (جلد دوم، ص ۲۱۔ ۲۲۰) میں مکمل۔

مکتوب غالب (۱):

مخدوم مکرم سیّد فرزند احمد صاحب کو سلام پہنچے۔ مجھ کو حضرت برجیس فطرت جناب حضرت صاحب عالم صاحبؒ سے نسبت اویسی ہے۔ غائبان حاضر کی فہرست میں پہلے میرا نام مرقوم ہے۔ آپ کی طرزِ نگارش نظماً او نثراً درخشندگی جوہر طبع سے خبر دیتی ہے۔ اگر آپ کی طرف سے استصلاح کا کلمہ درمیان نہ آتا تو میں فضولی نہ کرتا[1] باوجود خواہش خدمت کیوں نہ بجا لاؤں؟ میں یہ چاہتا ہوں کہ میری معلومات آپ پر مجہول نہ رہیں۔[2] مجموع ایک ورق میں کیوں کر گنجائش پائیں۔ ناگزیر جو اس نظم و نثر میں ہے، اس کو عرض کرتا ہوں۔

"بسر درآوردن" "مخلِ معنی" "درآوردن" کافی۔ "شور در سر انگیختن" ٹکسال باہر "از سر انگیختن" مناسب۔ "نہ برانگیزد" و "نہ برخیزد" فارسی ہند، "برنہ خیزد" و "برنینگیزد" فارسی عجم۔ "بر" لفظ زاید اور نون مفیدِ معنیِ نفی۔ لفظ زاید ماقبل کلمہ چاہیے۔ "نالہ ہا کہ از دل سر برزدہ اند" یعنی چہ؟ غیر ذوی الروح بلکہ غیر ذوی العقول کی جمع کی خبر بہ صیغۂ مفرد رسم ہے۔

"پریستان" اصل لغت، مخفف اس کا بہ حذف تحتانی "پرستان"۔ "پری استھان" توہّم محض، مگر یہ بھی یاد رہے کہ آدم الشعراء رودگی (کذا) سے فخر المتاخرین شیخ علی حزیں تک کسی کے کلام میں "پریستان" یا "پرستان" دیکھا نہیں۔

---

[1] "مرقع فیض" میں یہ لفظ نہیں ہے۔
[2] "مرقع فیض" میں یہ خط یہیں تک نقل کیا گیا ہے۔

حضرت صاحب قبلہ کی جناب میں میرا اسلام عرض کیجیے اور کہیے کہ آپ کا عطوفت نامہ اور ساتھ اس کے چودھری صاحب کا مودت نامہ پہنچا، دونوں نگارشیں جواب طلب نہ تھیں۔ کل میں نے ایک چھاپے کی کتاب کا پارسل جس کا عنوان سید فرزند احمد صاحب کے نام کا ہے، ارسال کیا ہے۔ آپ بھی بہ نظر اصلاح مشاہدہ کیجیے گا۔ ہاں پیر و مرشد! فارسی کے کلیات کو بھی کبھی آپ دیکھتے ہیں یا نہیں؟ بقول انشاء اللہ خاں:

یہ مری عمر بھر کی پونجی ہے

جناب سید فرزند احمد صاحب سے التماس ہے کہ حضرت صاحب کو سلام و پیام پہنچا کر حضرت شاہ عالم صاحب کو اور ان کے اخوان کو اور حضرت مقبول عالم کو میرا سلام کہیے گا اور جناب چودھری عبدالغفور صاحب کو سلام کہہ کر یہ فرمائیے گا کہ وہ اپنے عم نامدار اور استادِ عالی مقدار کو میرا سلام کہیں۔ زحمتِ تبلیغ سلام و پیام، تقدیمِ خدمتِ اصلاح کا دست مزد ہے۔ والسلام

نجات کا طالب، غالب

یوم الخمیس ذی الحجہ، و ۱۲ مئی سال حال۔

"جلوۂ خضر" میں بہ صراحت کی گئی ہے کہ یہ خط "دہم ذی الحجہ ۱۲۸۰ ہجری یوم سہ شنبہ کو" مارہرہ میں صفیر کو ملا۔ (تقویم کے مطابق عیسوی تاریخ ۱۰ مئی، ۱۸۶۴ء)۔ گویا غالب نے یہ خط ۱۲ مئی ۱۸۶۴ء مطابق ۵ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کو لکھا۔ مولانا مہر نے خطوطِ غالب[1] میں اس کی "تاریخ ۱۲ ذی الحجہ درج کی ہے جو درست نہیں۔

غالب نے مذکورہ خط ارسال کرنے سے ایک روز قبل ایک مطبوعہ کتاب کا پارسل بھی صفیر کے نام بھیجا تھا۔ یہ مطبوعہ کتاب "مثنوی ابر گہر بار" تھی جو صفیر کو غالب کے خط سے قبل ملی۔ صفیر نے

---

[1] جلد دوم لاہور ۱۹۶۹ء ص ۳۹۳

اس تحفے کی وصولی پر شکریے کے طور پر "صبح امید" کے نام سے ایک مثنوی لکھی - یہ مثنوی "جلوۂ خضر" جلد دوم (ص ۲۲۳ - ۲۲۱) میں شامل ہے اور یہاں درج کی جا رہی ہے۔ اس مثنوی کا اصل مسودہ صفیر کے ذاتی کاغذات میں محفوظ ہے، اس میں اور مطبوعہ مثنوی میں کہیں کہیں فرق ہے۔ حواشی میں اس فرق کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ یہ مثنوی غالب نے بعدِ اصلاح صفیر کو واپس کر دی۔ غالب کی اصلاحیں بھی حواشی میں درج کر دی گئی ہیں۔ "جلوۂ خضر" میں مثنوی اس عنوان کے تحت درج کی گئی ہے:

"مثنوی صبح اُمید بندہ صفیر بشکریۂ ورود مثنوی 'ابر گہر بار' حضرت غالب۔"

قلمی مسودے میں مثنوی سے قبل یہ عبارت ہے:

"مثنوی صبح امید در شکریۂ عنایت مثنوی ابر گہر بار کہ مرزا اسداللہ خاں غالب از دہلی بہ بندہ فرزند احمد صفیر بلگرامی بر ڈاک روانہ فرمودہ، بہ مقام مارہرہ ضلع ایٹہ، بتاریخ ہشتم ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ، گفتہ شد۔"

مثنوی کے اختتام پر یہ عبارت ہے:

"بفکر دو ساعت از نصف النہار بمقام مارہرہ بتاریخ ہشتم ذی الحجہ روز یک شنبہ ۱۲۸۰ ہجری۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی غالب کے مذکورہ خط سے (جو ۱۰ ذی الحجہ کو موصول ہوا تھا) دو روز قبل ملی تھی اور صفیر نے اسی روز "صبحِ اُمید" لکھی۔ صفیر نے "صبح امید" غالب کو بھیجی تو اس کے ساتھ مندرجہ ذیل خط بھی تھا۔ یہ خط "انشائے سبد گل" (ص ۱۴) میں شامل ہے۔

مکتوب صفیر (۳):

"جو شکر کہ کبھی ادا نہ ہو سکے اور جو فخر کہ ذرّے کو آفتاب تک پہنچا دے، میرے لیے اس کی ضرورت ہے اور اُس کی صورت ہے یعنی آج حضرت عالی مرتبت مرزا اسداللہ خاں صاحب غالب تخلص کا سرفراز نامہ معہ خریطۂ مثنوی "ابر گہر بار"

ہدیتاً مجھ کو پہنچا اور نامۂ عنبریں شمامہ سے ظاہر ہوا کہ مجھے بڑے وسیلے کے سبب اپنی شاگردی میں قبول فرمایا:

میں گرد اپنے آپ پھروں فخر سے صفیر
شاگرد مجھ کو غالبِ ذی جاہ نے کیا

خدایا مجھے وہ زبان دے جو اس کا شکر کر سکے۔ بالفعل زبانِ خامہ سے کام لوں اور ایک مثنوی شکریہ میں "صبح امید" نام کہہ کر بھیجوں۔ لو صفیر تائید غیبی ہوئی۔ دو گھنٹے میں مثنوی لکھی گئی۔ اب جلد لفافہ کر کے دہلی کو روانہ کرو۔"

اس مکتوب سے پہلے "انشائے سبدِ گل" میں مندرجہ ذیل تمہیدی عبارت لکھی گئی ہے:

"جواب الجواب از طرف حضرت استادی معہ شکریہ مثنوی ابرگہر بار موسوم بہ مثنوی 'صبح اُمید' کہ سابق در مطبع بابو سنت پرشاد صاحب طبع شد۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی "جلوۂ خضر" میں شامل ہونے سے پہلے علیحدہ طور پر بھی چھپ چکی ہے۔ یہ مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہے۔ مثنوی "صبح امید" کا متن یہ ہے:

مثنوی "صبح امید"

زہے جلوہ زار صباحِ امید
کہ بہرِ من از شرق دہلی دمید[1]
چہ صبحے کہ صبح بنا گوشِ حور
کند از تجلیِ او کسبِ نور

---

[1] زہے نور پاشیِ صبحِ اُمید
کہ بر من ز دہلی افق بر دمید
(مسودۂ صفیر)

صباحے کہ می تابد از باب دل
شب او شب قدر ارباب دل
صباحے کہ مست وی اند اہل ہوش
بدنبال او خور صبوحی بدوش[1]
صباحے کہ زو گشت ہشیار مست
مکاں مست در مست دیوار مست
چو بر تافت از شرق ایں صبح نور
پدیدار شد بیک فرخ چو ہور[2]
بہ تارک چو خورشید تاج زرش
ببر در قبائے ضیا گسترش
ز تار شعاعی کمربند او
چو صبح تمنا شکر خند او
خرامندہ چوں ساقیِ نیم مست
چو جام مَیم داد ابرے بدست
چہ ابرے کہ نامش ' گہربار ' شد
چہ گوہر کہ انجم ازو خوار شد
چہ ابرے کہ بارد بکشت امید
تر و تازہ ازوے بہشت امید
چہ ابرے کہ چوں زلف مشکین پرند
چو قطرات در وے دل خلق بند

---

[1] " بدنبال او خور صبوحی فروشش " (اصلاحِ غالب)
[2] " جلوۂ خضر " میں اس لفظ کے اوپر باریک خط میں لفظ " آفتاب " لکھا ہے۔

چہ ابرے کہ از وے شب زلف ماہ[1]
ز صبح بناگوش شد پردہ خواہ[2]
چہ ابرے کہ در صورت آئینہ سان
ولے پیکر خوش بمعنی نہان
چہ ابرے کہ ظاہر چو اوراق نور
بباطن ہمہ مصحفِ روئے حور
بیا و ببین در نوردِ ورق
روان آب حیوان چو بر رو عرق
سوادش سواد دو چشم پری
صفا ریز در پردۂ عبہری
بیاضش بیاض گلوے بتان
بشیرازہ در تار موے بتان[3]
بر اوراق صافش سواد سطور
بر آوردہ عنبر ز دریاے نور
نگارین کتابے چو اوراق گل
بظاہر چو جزوے بباطن چو کل
زہے بخت فرزند احمد صفیر
شد از نیرِ سعد نیرو پزیر

---

[1] "چہ ابرے کزو روز گیسو سیاہ" (اصلاحِ غالب)

[2] "ز صبح بناگوش شد باج خواہ" (اصلاحِ غالب)

[3] "باب و بتابے چو روئے بتان" (مسودۂ صفیر)

زہے قوّتِ طالعِ غالبش[1]
کہ آمد چنین تحفہ از غالبش

چہ غالب کہ غالب بود از ازل
بنظمِ قصیدہ ، بفکرِ غزل

دبیر فلک مرتبت ، نجم فر
ز طبعش نظام سخن بہرہ ور

چہ شیرے کہ نامش نگنجد عیان
بہ بیدائے دُور و درازِ بیان[2]

بباطن چو پرسی بگوئیم نام
اسد خود بہ اللہ قربش مدام

کلیمِ سخنور سرِ آستان
عصا در کف از کلکِ گوہر فشان

فغانیؔ کہ جادو بیانی کند
سر کوے او پاسبانی کند

ہلالیؔ روان و دواں در رکاب
دل فیضیؔ از طبع او فیض یاب

نظامیؔ پے نظمِ ملک سخن
بود پیشکارش بہر علم و فن

---

[1] "زہے طالع فرّخ غالبش" (مسودۂ صفیر)

[2] "بہ بیدائے وزن کار آگہاں" [کذا] (مسودۂ صفیر)

به جامی سپرد است مے خانه را
که ناظر بود دورِ پیمانه را
سرِ چاکرانش که خسرو بود
شب و روز اندر تگ و دو بوُد
ز فردوسی اینک چه جوئی نشان
به گلزار فکرش بود باغبان
هم او را سزد ایں سخن گستری
که دارد بهسر ره شناساوری
کلامِ حسینش کشود است دل
ز نازک خیالاں ربود است دل
گران سنگیِ نغمه ها ے سبک
ز سنگین دلان همچو ظرف تنک
بر آرد صدائے که غوغا فتد
بجان آتشِ سنگ خارا فتد
من و وصف او اے عجب اے عجب
مگر هم ز قولش دهم زیب لب
نویسد هم او در همان مثنوی[1]
بهنجار جادو بیانِ قوی[2]

---

[1] "سراید هم او در هماں مثنوی" (مسودۂ صفیر)

[2] "زبانش پر از منطقِ پهلوی" (اصلاحِ غالب)

اشعار مثنوی ابر گہر بار غالب:

سخن را خود آنگونہ دانم سرود
کزیں نیز خوشتر توانم سرود

چہ غم گر فلک زنگم از روے برد
توانم ز خود در سخن گوے برد

نہ نالم ز پیری ، جوانم بہ رائے
ہنوزم بود طبع زور آزمائے

سخن سنج معنی طرازم ہنوز
بشیوائیِ شیوہ نازم ہنوز

بہر بذلہ کز لب فشانم چو قند
خضر "در من قال" گوید بلند

بدستان زنی خامہ منقار من
ہدر خونِ مرغِ گل از خار من

توانم کہ در کارگاہ ہنر
بہ نیروے یزدانِ پیروز گر

ز ہم بگسلم پاستانی طراز
سخن را دہم جاودانی طراز

گزشت آنکہ دستان سرائے کہن
ز کیخسرو و رستم آرد سخن

منم کم بود در طراز کلام
شہنشہ پیمبر سپہبد امام

ز فردوسیم نکته انگیز تر
ز مرغ سحر خوان سحر خیز تر

اگر جاے دستان سرائی بُدے
ره و رسم جادو نوائی بُدے

زبان را به رامش گرو کردمے
دمِ جنبشِ زخمه نو کردمے

ہم زخمہ از دیگران تیز تر
ہم ساز دانش نوا خیز تر

به آزادگی خسروی می کنم
بدیں پشت دانش قوی می کنم

نباشد اگر پاے دین درمیان
نہم ہفت خوان بلکه هفتاد خوان

پرم از تو برتر ببال گزاف
تو سیمرغ آری و من کوه قاف

تو سوسن فرستی بخنیاگری
مرا جنبش کلک رقص پری

بازگشت خامہ بسوے مدعا:

چو خود گفت و دُر سفت پایان کار
چه آید ز من مدح شایان کار[1]

---

[1] "چه آید ز من حرف شایان کار" (مسودۂ صفیر) اس کے بعد ایک شعر مسودے میں زاید ہے:

ز گفتار اویم ستایش گرش
ز اشعار اویم ستایش گرش

ز دریوزه اش انچه من یافتم
فشاندم بپایش چو دریافتم
چه خوش گر ز ورد کلام خوشش
هم از بردن حرف نام خوشش
بیانم چو داد معانی دهد
زبانم ز عقدة اللسانی رهد
که نامش هزاران اثر می دهد
ز همنام اویم خبر می دهد
زہے قوّتِ بختِ سعد و نکو[1]
مدد یابم از بردنِ نام او
ز همنام خویش است او را مدد
بهم نام او صد مدد از صمد[2]
چه همنام امام طریق ہدے
اخ مصطفےؐ ، بابِ علمِ خدا
حنا بند دستِ مطالب هم اوست
که غالب علیٰ کل غالب هم اوست
خدایا ز دیدار او شاد کن
دو چشم مرا حیرت آباد کن

---

[1] "خوشا من خوشا بختِ سعد و نکو" (مسوده صفیر)

[2] " به همنام او صد مدد از احد" (مسودهٔ صفیر)

چو این لطف عامش که خاصم شده است
دلیل رہ اختصاصم شده است
فرستم ازین جا باد و صد ثنا[1]
دعائے فراوان و بے حد ثنا
ز بہر من از داور داد گر
رسید این سعادت به مارہرہ در
چہ مارہرہ رشک بہشت برین
نیاگانِ ما را مقام گزین[2]
بزرگے کہ من نبسۂ او ستم
بود فخرِ دوران بیزدان قسم[3]
بعلم و بعقل و به ہمت بلند[4]
رسد بر سر عرش او را کمند
به اسم و عَلم صاحبِ عالم است[5]
مسمّاش ہم صاحبِ عالم است

---

[1] ز من صد دعا و ز من صد ثنا
دعا بلکہ بسیار و بے حد ثنا (مسودۂ صفیر)
[2] بزرگانِ ما را اقامت گزین (مسودۂ صفیر)
[3] ز خاصان بود ہم به یزدان قسم (مسودۂ صفیر)
[4] بعلم و بدانش چو ہمت بلند (مسودۂ صفیر)
[5] ہمانا کہ او صاحبِ عالم است
ولے نام او صاحب عالم است (مسودۂ صفیر)

ز رافت ز اقران و امثال بیش[1]
بہین یادگارِ بزرگانِ خویش
دبیرے بدرگاہِ او تیرِ چرخ
مریدانِ او جملہ تا پیرِ چرخ[2]
ز غالب بود ہر زمان نظم جو
کہ ہم فنِ او ہست و ہم عمرِ او
نبشتم بشکریّہ ایں شعر چند
صفیر از من این و ز غالب پسند[3]

مثنوی پر اصلاح دینے کے ساتھ غالب نے ایک خط لکھا جو پہلی مرتبہ مکمل صورت میں "انشائے سبدگل" (ص ۱۳) میں شامل ہوا۔ دوسری مرتبہ "مرقع فیض" میں (ص ۸۳-۸۲) نامکمل صورت میں طبع ہُوا۔ تیسری مرتبہ "جلوۂ خضر" (دوم، ص ۲۲۴) میں

---

[1] ز صاحب دلاں او بہ سجادہ در
بود یادگارِ بزرگاں بہ فر (مسودۂ صفیر)

[2] نگارندۂ پایہ اش تیرِ چرخ
یکے از مریدانِ او پیرِ چرخ (مسودۂ صفیر)

اس کے بعد مسودہ صفیر میں یہ دو شعر زاید ہیں:

توجہ بہ ارباب فن بیشتر
توغل بہ شعر و سخن بیشتر
خدایا بود ظلِ او بر سرم
بحقِ نبیؐ و علیؑ از کرم

[3] "الٰہی شود غالبم را پسند" (مسودۂ صفیر)

چھپا او۔ اس میں بھی نامکمل ہے۔ "مرقع فیض" میں یہ خط "۔ ۔ ۔ ۔ معنوی نسبت میں پاہیے" تک ہے اور پھر "نجات کا طالب، غالب ۱۲۔ یوم الخمیس پنجم ذی الحجہ، ۸، ۱۲ھ" کے الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ "جلوۂ خضر" میں "۔ ۔ ۔ ۔ یہ ریاضت کہاں" تک کی عبارت درج کرنے کے بعد "۱۲ غالب" کا اضافہ کر کے خط ختم کر دیا گیا ہے۔

"انشائے سبد گل" اور "جلوۂ خضر" میں تاریخ نہیں لکھی گئی۔ "مرقع فیض" میں تاریخ اور سنہ دونوں صریحاً غلط ہیں۔ یہ خط "مثنوی صبح امید" کی اصلاح کے ساتھ آیا تھا۔ مثنوی ۸۔ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ کو لکھی گئی تھی، اگر یہ دوسرے دن (۹ ذی الحجہ) ڈاک کے حوالے کی گئی ہو تو غالب کو چوتھے یا پانچویں روز (۱۳ یا ۱۴ ذی الحجہ) ملی ہوگی۔ یہ خط اسی مہینے میں ۱۳ یا ۱۴ ذی الحجہ کے بعد کسی جمعرات کے دن لکھا گیا ہے۔ تقویم کے مطابق ۱۲۸۰ھ میں ۱۹ یا ۲۶ ذی الحجہ کو جمعرات کا دن پڑتا ہے، اس لیے یہ خط انھیں دو تاریخوں میں سے کسی ایک میں غالب نے لکھا ہوگا۔ غالب کا خط ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس کا متن "انشائے سبد گل" کے مطابق ہے۔ "انشائے سبد گل"، "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں اس خط کے متن میں کہیں کہیں لفظی اختلافات ہیں، حواشی میں ان کی صراحت کر دی گئی ہے۔

مکتوب غالب (۲):

"مخدوم زادۂ مرتضوی دودمان، سعادت و اقبال توامان، مولوی سیّد فرزند احمد صاحب کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ میں نے جو استصلاحِ اشعار میں امتثالِ امر کیا ہے تو اس واقعہ کو یوں سمجھ لیا ہے کہ میں جناب[۱] امیر المومنین کا بوڑھا غلام ہوں۔ امیر نے اپنی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے اور حکم دیا[۲] ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر۔ ورنہ میں کہاں اور یہ ریاضت کہاں۔

اس صفحے کے حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ ہوں

اپنے ناناصاحب کی خدمت میں میری بندگی عرض کیجیے گا۔ اگرچہ حضرت میرے ہم عمر ہیں مگر ان کے ابوالآباء کا غلام ہو کر سلام کیا لکھوں۔ مجھ کو ارادت میں ان سے نسبت اویسی ہے اور محبت بھی بے تکلف ویسی ہے جیسی اس معنوی نسبت میں چاہیے۔

جناب صاحبزادہ ہائے مرتضوی گہر حضرت سید عالم صاحب اور شاہ عالم صاحب اور مقبول عالم صاحب اور خورشید عالم صاحب کو دعا ہائے درویشانہ اور سلام ہائے مسنون۔ حضرت رفعات درجات مولوی سید محمد امیر صاحب کی جناب میں بعد ۔ ۔ ۔ [1] نیاز کے معروض ہے کہ خزف بہ زائے ہوز بے شک زبان دری میں سفال ۔۔۔ لغات عربی میں اس کا نشان پایا جانا از روئے تعریب پایا۔۔۔ بلسانین ہوگا۔ ہرچند زبان عجم میں اشتراک نادر ہے مگر ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں جیسا کہ تخت ۔ ۔ ۔ مشترک بین اللسانین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

غالب

۱۲۰۱ ہجری میں صفیر نے "بوستان خیال" کے ترجمے "پرستان خیال" کی پہلی دو جلدیں شائع کیں۔ غالب کو اس کی خبر ہوئی تو انھوں نے صفیر کو ایک خط لکھ کر یہ کتاب طلب کی۔ یہ خط پہلی مرتبہ "انشائے سبدگل" (ص ۱۴۱) میں چھپا۔ بعد میں "مرقع فیض" (ص ۸۳) میں شامل کیا گیا۔ اس میں "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بالغ

---

[1] کرم خوردہ مقامات پر نقطے لگائے گئے ہیں۔

پچھلے صفحے کے حواشی

[1] لفظ "جناب" 'مرقع فیض' اور [1] 'جلوۂ خضر' میں نہیں ہے۔

[2] الفاظ" اور حکم دیا ہے" 'جلوۂ خضر' میں نہیں ہیں۔

نظران ہند پر عموماً" کے بعد "غالب ۱۲۔۸ ذی قعدہ، ۱۲۸۱ ہجری" لکھ کر خط ختم کر دیا گیا ہے۔ اس کے بعد کی عبارت "مرقع فیض" میں نہیں ہے۔ "جلوۂ خضر" (جلد دوم، ص ۲۲۳) میں بھی یہ خط شامل کیا گیا ہے۔ "جلوۂ خضر" میں بعض جگہ لفظی اختلافات ہیں۔ ذیل میں یہ خط درج کیا جاتا ہے۔ حواشی میں اختلافات کی صراحت کی گئی ہے۔

مکتوب غالب (۳):

"نورِ نظر[۱]، لختِ جگر، زبدۂ اولادِ پیغمبر، حضرت مولوی سید فرزند احمد[۲] زاد مجدہٗ اس درویش گوشہ نشین کی دعا قبول فرمائیں۔ "بوستانِ خیال" کے ترجمے کا عزم اور دو جلدوں کا منطبع ہو جانا مبارک۔ حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور جمیع[۳] بالغ نظرانِ ہند پر عموماً . . . [۴] (کذا) جناب میر ولایت علی صاحب سے بعد ارسال قیمت و محصول دو جلدیں مانگی ہیں، خدا کرے وہ پارسل پہلے بھیجیں اور یہ رقعہ[۵] تمھارے پاس بعد۔ (مہر: غالب ۱۲۷۸ھ) ۸ ذیقعدہ ۱۲۸۱ ہجری"۔

صفیر نے غالب کے مذکورہ خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط "انشائے سبد گل" (ص ۱۸-۱۵) میں شامل ہے۔

---

[۱] جلوۂ خضر میں "نورِ چشم" ہے۔

[۲] جلوۂ خضر میں "احمد" کے بعد "صاحب" کا اضافہ ہے۔ مرقع فیض میں "مولوی" سے پہلے "حضرت" نہیں ہے۔

[۳] جلوۂ خضر اور مرقع فیض میں لفظ "جمیع" نہیں ہے۔

[۴] جلوۂ خضر میں نقطے نہیں ہیں۔

[۵] جلوۂ خضر میں "رقم"۔

مکتوب صفیر (۴) :

"بحضرت عالی مرتبت، فخر المتقدمین، استاد المتاخرین، جناب معلیٰ القاب، نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر نظام جنگ مدظلہ العالی۔ صفیر ژولیدہ تقریر کی تسلیم نیاز بے انداز کے ساتھ قبول ہو۔ نوازش نامہ بطلب جلد مطبوعہ "پرستان خیال" بنام میر ولایت علی صاحب اور میرے، مشعر اشتیاقِ مالایطاق ورود پایا۔ جو فقرہ کہ حضور نے نادیدہ "پرستان خیال" کی تعریف میں لکھا ہے۔ میرے افتخار اور استظہار کا باعث ہوا۔ خداوند تعالیٰ سلامت رکھے اور ہم شاگردان ہیچمدان ہمیشہ فیض یاب رہا کریں۔ پرستان خیال کی دونوں جلدیں روانہ ہوتی ہیں، پہنچیں گی۔ قیمت کی احتیاج نہیں، ٹکٹ واپس ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگوں سے سنا ہے کہ حضور کو معما میں بہت دخل ہے۔ اس لیے

لہ 'عود ہندی' میں چودھری عبد الغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کر کے غالب لکھتے ہیں :

"حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا، بوستان خیال کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقت پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پہ سے اٹھاؤں۔"

یہاں 'بوستان خیال' سے یقیناً ترجمۂ 'بوستان خیال' از صفیر بلگرامی مراد ہے۔ ورنہ حضرت صاحب عالم کو "دانہ ڈالنے" کی کیا ضرورت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ عالم کو صفیر نے اطلاع دی ہو گی کہ "پرستان خیال" کی پہلی دو جلدیں غالب کو بھیجی جا چکی ہیں۔ صاحبِ عالم نے ان جلدوں کے بارے میں غالب کی رائے طلب کی ہو گی۔ "خطوط غالب" (از مولانا مہر) اور "عود ہندی" (مجلس ترقی ادب لاہور) میں اس خط کا زمانہ تحریر ۱۸۶۲ء درج ہے۔ "پرستان خیال" کی مذکورہ جلدیں ۱۲۸۱ھ میں چھپیں، اس لیے اس خط کا زمانۂ تحریر ۶۵-۱۸۶۴ء ہو سکتا ہے۔

بعض دقیقہ سنج مجھ سے استمداد کرتے ہیں کہ تو منگا دے اور مجھے بھی اشتیاق ہے۔ امید ہے کہ اس عنایت سے بھی ممتاز ہوں۔ مثنوی "صبح امید" بہ شکریہ مثنوی ابر گہر بار اصلاح شدہ کہ صرف دو جگہ بنائی گئی ہے۔ وردد ہوئی اور قلت اصلاح پر طبیعت کو بڑا بھروسا بندھا۔ دو تین غزلیں اردو اب بھیجی جاتی ہیں۔ امید کہ جلد اصلاح سے مزین ہوکر آئیں کہ یہاں سے اور بھی جائیں، کس لیے کہ اب غزل سرائی میں مزا نہ رہا۔ جی میں ہے کہ آپ کی نگاہ سے اپنا سب کہا سنا گزران کر چھپوا دوں۔ زیادہ تمنائے حضوری ہے۔

رباعیات

اب ذکر شباب ہے کہانی افسوس
آگے قدر اس کی کچھ نہ جانی افسوس
و نقشِ قدم تک نہیں ملتا ہے صفیر
کن پاؤں چلی گئی جوانی افسوس

دنیا ہے گزرگاہ خبردار رہو
تاکو نہ کسی کا مال ہشیار رہو
اک دن دنیا کو چھوڑ دینا ہے صفیر
اپنی شے سے بھی دست بردار رہو

کم زور قدم ہیں، بے بصر شیب میں آنکھ
داخل نہ قوا میں پاؤں، نہ زیب میں آنکھ

حرکت ہے بے عصا و عینک دشوار
رکھ پاؤں میں ہاتھ اور رکھ جیب میں آنکھ

کیا کہیے کہ طبع کیسی گھبراتی ہے
گُلکنت مرے کہنے میں نہیں آتی ہے
اس عُقدے کا باعث سخنِ تر ہے صفیر
بھیگے جو گرہ اور بھی جم جاتی ہے

مے کش تھے کبھی ہم بھی جوانوں کی طرح
اب ہو گئے وہ جلسے فسانوں کی طرح
پیری میں کریں سلسلۂ سبحہ درست
پھر کاش ہوں جمع لوگ دانوں کی طرح

سو بار طلب نزع میں ہر چند رہی
پر اُن کی ادا وضع کی پابند رہی
کچھ[1] . . . . کو ہم
آنکھیں تو کھلیں رہیں زباں بند رہی

---

[1] کِرم خوردہ

ابیات جناب اوستادی[1]

غصّے میں کیا علاج کیے دل کی ٹیس کے
ہیرا کھلا دیا مجھے دانتوں کو پیس کے

دونوں رخ اے صنم ترے خوش خط ہیں کس قدر
قطعے لکھے ہوئے ہیں کسی خوشنویس کے

دیکھو شکستہ حالیِ دیوانگانِ عشق[2]
دامن پھٹے ہیں دس کے، گریبان بیس کے

تیغِ نگاہِ ناز کے جوہر چمک گئے
سرمے نے کھل کے رنگ دکھائے کسیس کے

جاتی رہیں صفیر وہ دقّت پسندیاں
اب ہیں مزے پڑے ہوئے لفظِ سلیس کے

ہوا ہے دل غمِ ساقیِ لا جواب میں آب
یہ شیشہ آپ ہوا حسرتِ شراب میں آب

ورق ہیں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل
لسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

میں محتسب ہی کو کوسوں گا پانی پی پی کر
تمام عمر پیوں گا غمِ شراب میں آب

---

[1] مراد صفیر بلگرامی

[2] ان اشعار میں سے بعض پر صاد بنے ہیں۔ کسی شعر پر ایک، کسی پر دو اور کسی پر تین۔ یہاں اسی اعتبار سے "صاد" درج کیے گئے ہیں۔ یہ وہ اشعار ہیں جو غالب کو پسند آئے۔ مکتوب صفیر بنام غالب (۵) میں ان کا ذکر ہے۔

نہا کے کون ہوا ہے کنارے دریا سے
کہ اپنی موج سے ہر دم ہے پیچتاب ہیں آب
تمھارے عشق کی تاثیر بحر و بر میں ہے
کہ پیچتاب ہیں ہے خاک ، اضطراب میں آب
کبھی ہوں گرم کبھی سرد ، حسب موقعِ وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

آہ اب ہونٹوں پر نہیں آتی
ہائے دل کی خبر نہیں آتی
تم رُلاتے ہو تو میں روتا ہوں
خود بخود آنکھ بھر نہیں آتی
کس طرح ہو گا وصل اے اللہ
کوئی صورت نظر نہیں آتی
ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی
ایک میری خبر ہے بس مفقود
شہر میں کیا خبر نہیں آتی
وہ نہ آئیں تو اختیار ہے کیا
موت بھی تو اِدھر نہیں آتی
بے[1] . . ہیں وُہ پھر ہم آتے ہیں
نیند بے[2] . . . . . . نہیں آتی

---

[1] و [2] کرم خوردہ

چرخ بلا[1] . . . . کچھ تو حال ہو معلوم
یُوں تو اُن کی خبر نہیں آتی
نہ سہی ہو حکومت ان پہ صفیر
چاہ بھی تم کو کر نہیں آتی

غالب نے صفیرؔ کے مذکورہ خط کا جواب ۲۵ ذیقعدہ ، ۱۲۸۱ھ کو لکھا - یہ خط پہلی مرتبہ" انشاے سبدگل" (ص ۱۸) میں طبع ہُوا - دُوسری مرتبہ" مرقع فیض" (ص ۸۴ - ۸۳) میں شامل ہوا اور آخر میں "جلوۂ خضر" (دوم ، ص ۲۲۴ - ۲۲۳) میں چھپا -

اس خط کا ایک حصّہ" نادر خطوط غالب[2]" میں چھپا تھا - رسؔا نے یہ حصّہ سیّد وصی احمد بلگرامی کے مقالے "س ش ص" سے نقل کیا تھا - بعد میں یہ خط مکمل صورت میں" مرقع فیض" سے اخذ کر کے " آج کل " دہلی کے اگست ۱۹۵۲ء کے شمارے میں قاضی عبدالودود نے چھپوایا تھا. مولانا مہر نے" نادر خطوط غالب" سے نامکمل خط " خطوطِ غالب" جلد دوم (ص ۷۹۶) میں شامل کیا اور ساتھ ہی "آج کل" سے مکمل خط بھی شامل کر لیا (خطوطِ غالب دوم، ص ۷۹۰) اور اس میں سے وہ عبارتیں نکال دیں جو " نادر خطوط غالب" میں آ چکی تھیں - اس طرح " خطوط غالب" میں اس ایک خط کے دو خط بن گئے.

ذیل میں" انشائے سبدگل" سے اس خط کا متن درج کیا جاتا ہے - حواشی میں "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" کے اختلافات کی نشان دہی کر دی گئی ہے.

مکتوب غالب (۴)

" بہ علاقۂ مہر و محبت نور چشم و سرور دل" اور[3] برعایتِ سیادت مخدوم و

---

[1] کرم خوردہ
[2] مرتبہ رسا ہمدانی ، کاشانۂ ادب لکھنؤ ۱۹۳۹ء
[3] جلوۂ خضر میں "و" بجائے "اور" -

مطاع مولوی سید فرزند احمد طال بقاؤہٗ و زاد علاؤہٗ اس مصرع سے میرا مکنون ضمیر دریافت فرمائیں :

بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما

یارب[1] وہ کون بزرگ ہیں کہ سودائی کو معائی سمجھتے ہیں ۔ اصلِ فطرت میں میرا ذہن[2] تاریخ و معما کے ملایم[3] نہیں پڑا ہے ۔ جوانی میں از راہ شوخیِ طبع گنتی کے تیں[4] عامیانہ معمے لکھے[5]، وہ مبادیِ کلیاتِ فارسی میں موجود ہیں ۔ تاریخیں اگر ہیں تو مادے اوروں کے[6] اور نظم فقیر کی ہے[7]۔ یہ کلام نہ بطریق کسرِ نفس ہے ، نہ بہ سبیل اغراق ۔ سچ کہتا ہوں اور سچ لکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔[8] (کذا) ۔ اس نامۂ مہر افزا کو دیکھ کر مبادیؔ پرستان

---

[1] یہاں سے "حکایت ہے شکایت نہیں" تک کی عبارت "مرقع فیض" میں نہیں ہے ۔

[2] "جلوۂ خضر" میں سہو کتابت سے "ذہین" لکھا ہے ۔

[3] جلوۂ خضر میں " ملایم و مناسب "۔

[4] لفظ "تیں" جلوۂ خضر میں نہیں ہے ۔

[5] جلوۂ خضر میں " لکھے ہیں "۔

[6] جلوۂ خضر میں " کے ہیں "۔

[7] یہاں "جلوۂ خضر" میں صفیر نے یہ حاشیہ دیا ہے :

"اصل حقیقت یہ ہے کہ بندہ صفیر نے حضرت غالب کو لکھا تھا کہ پٹنہ کے لوگ آپ کے معمّا اور چیستان کے مشتاق ہیں کہ ان لوگوں نے آپ کو معمّا میں کامل سنا ہے ۔ اس کے جواب میں یہ عبارت حضرت غالب نے تحریر فرمائی "۔

(جلد دوم ، ص ۲۲۳)

[8] یہ نقطے جلوۂ خضر میں نہیں ہیں ۔

خیال" کی عبارت یاد آئی۔[1] افسوس ہے کہ اس ہیچ میرز کے اجزائے خطابی اُس مسودے کی تسوید کے وقت تک آپ نے نہیں سُنے تھے، ورنہ اس کے کیا معنی کہ خط میں لکھے جائیں اور کتاب میں اندراج نہ پائیں۔ محمد رضا برق کا خطاب معلوم تھا تو آپ نے لکھا ہے، حکایت ہے شکایت نہیں ..... (کذا) ۔ پہلی جلد جس کا نام " افق الخیال" ہے اس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو، بے طلب بھیج دیں اور معاً قیمت لکھ بھیجیں ..... [2] اشعار گہر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، سب اچھے ہیں۔ مگر جو میرے دل میں اُتر گئے ہیں وُہ تم کو لکھتا ہُوں:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

کیوں حضرت! "ابھی کچھ" کی تحتانی کا دبنا کیا[3] غیر فصیح نہیں؛

---

[1] حاشیہ از صفیر بلگرامی:
" اس کی حقیقت یہ ہے کہ میں نے خط جو حضرت غالب کو بھیجا تھا، اس کے القاب میں حضرت کا خطاب نجم الدولہ دبیر الملک نواب اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ بھی لکھا تھا اور 'پرستانِ خیال'، ترجمہ 'بوستان خیال' میں جو شعراء کی فہرست ہے، اس میں یہ خطاب نہیں لکھا تھا اور محمد رضا برق کا خطاب لکھا تھا۔ حضرت نے جب پرستان خیال کو دیکھا تو یہ شکایت مجھے لکھی۔" (جلوۂ خضر، دوم، ص ۲۲۴)

[2] " انشائے سبدگل" میں اس جگہ نقطے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ عبارت کا کچھ حصہ ترک کیا گیا ہے، لیکن " مرقع فیض" میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں۔ " جلوۂ خضر" میں بھی اس جگہ نقطے ہیں۔

[3] "کیا" جلوۂ خضر میں نہیں۔

کچھ ابھی بات کر نہیں آتی

کیااس کانعم البدل نہیں ہے[1]

ورق میں جوشش مضمون گریہ سے بادل

بسان ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

در فائل: کبھی ہوں گرم کبھی سرد حسب موقعِ وقت

صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

عارفانہ وموحدانہ مضمون اور بالغانہ الفاظ۔

تم سلامت رہو قیامت تک

صحت و لطفِ طبع روز افزوں

نجات کا طالب[2]، غالب ۱۲

غالب کے مذکورہ خط کی وصولی کے فوراً بعد صفیر بلگرامی نے اس کا جواب لکھا، غالب کی طرف سے جواب الجواب بھی جلد ہی آیا۔ صفیر و غالب کے یہ خط ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ اور ہفتم ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کے درمیان لکھے گئے، کیونکہ ان دو تاریخوں کے غالب کے دو خط موجود ہیں۔ (ان میں سے ایک اُوپر درج ہو چکا ہے اور دُوسرا یعنی غالب کا صفیر کے نام آخری خط آگے درج ہوگا)۔ صفیر نے غالب کے ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کے خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط "انشائے سبدگل" (ص ۲۰-۱۸) سے نقل کیا جا رہا ہے:

مکتوب صفیر (۵):

"قبلۂ سخن سنجانِ معانی شناس و کعبۂ نکتہ دانانِ والا اساس!، نجم...[3]

[1] "کیوں حضرت" سے یہاں تک کی عبارت مرقع فیض میں نہیں۔

[2] "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں اس کے بعد یہ تاریخ ہے: "شنبہ ۲۵ ذی قعدہ، ۱۲۸۱ ہجری"۔

[3] کرم خوردہ

بلا . . . . . . دبیر بے نظیر فلک ابہت وکرامت جناب عالی مناقب حضرت غالب مطلوب ہر طالب مدظلہ العالی ۔ صفیر کج مج تقریر تسلیم کو ذریعۂ عبودیت اور عبودیت کو وسیلۂ عزت جان کر جو کچھ عرض کرے وہ یہ ہے ۔ نوشتۂ شفقت سرشتہ جس کے ہر لفظ سے شفقتِ کاملہ کی نزاوش تھی ، ورود ہو کر سرفراز کیا۔ گلہ سنجی حضور کی میرے سر آنکھوں پر، اجزائے خطابی کا مبادیٔ بوستانِ خیال میں نہ لکھنا بخدا سہواً تھا نہ عمداً۔ اب آپ ہی کے شعر کو شفیع سمجھ کر اُمیدوارِ عفو ہوں :

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

'افق الخیال' جب چھپ کر نکلے گی ، پہلے آپ کے پاس پہنچے گی ، بعد میرے پاس' خاطر شریف مطمئن رہے . . . . . (کذا) غزلیاتِ مرسلہ پر جابجا صاد دیکھ کر اور چند اشعار ، جو حضور کو پسند آئے ہیں ، ان کے ساتھ چند فقرۂ دلچسپ ملاحظہ کر کے بیں اس قدر بالیدہ ہوا جس کی شرح نہیں ۔ خدا آپ کو سلامت رکھے . . . . (کذا) پہلے شعر مطبوعۂ خاطر اقدس پر جو اصلاح ہوئی کہ :

کچھ ابھی بات کہ نہیں آتی

درست ہے ۔ مگر زبان دانانِ لکھنؤ کے یہاں عام حروفِ علت آخر لفظ 'ہندی کا گرانا جائز ہے اور غیر زبان کے لفظ کا ناجائز۔ مخصوص حروف علت میں الف اور یائے تحتانی پر تو ہمیشہ مار رہتی ہے ، ہاں فصحا بہ ضرورت اور حسب موقع دباتے ہیں اور کبھی الف اور یائے تحتانی کے بعد اگر 'نون' بھی ہو ، اصلی لفظ یا جمع کے حروف میں بھی دب جاتا ہے ۔ آتش :

جباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا کی جدائی کا

"میں" اور" ہوں" کے حروف دوم اور سوم دب گئے ۔ ناسخ :

خوں رلاتا اسے ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

"کبھی خنداں" بروزنِ فعلاتن میں یائے تحتانی "کبھی" کی دب گئی ۔
اسی طرح " ابھی کچھ با" فعلاتن کے وزن پر ہے ۔ زیادہ مثالیں نہ لکھیں کہ ۔ ۔ ۔ [1]
سے واضح ہوں گی ۔

اور دہلی بھی اس سے خالی نہیں ہے ۔ خیال آتا ہے کہ یہ مطلع
حضور کا ہے ۔ دیوان آپ کا اِس وقت موجود نہیں :

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

"بھی تو ویراں" فعلاتن کے وزن پر ہے ۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں ، فی الحقیقت
خلاف ہے ، مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوص فارسی وعربی ہیں ۔ اُردو میں نہ تھے ، نہ
ہیں ، نہ ہوں گے ۔

حضور محقق اور راغب فارسی ہیں ۔ یہ باتیں جی میں کھٹکتی ہوں گی ۔

خیر ہر زبانے و ہر بیانے ، اپنا اپنا اجتہاد ہے ، زیادہ کیا عرض کروں ۔

ملازمت کے وقت میں نے خواجہ فخرالدین صاحب سخن جن کا دادھیال
لکھنؤ اور ننھیال دہلی میں ہے اور غدر کے سال میں بہ عمر چاردہ پانزدہ سالگی
آرہ میں تشریف لائے اور جناب محمد ابراہیم صاحب خلف مرزا محمد صدیق صاحب

---

[1] چند الفاظ کرم خوردہ ۔

کی صاحبزادی سے منسوب ہوئے اور مجھ سے تلمذ کیا اور قصہ مسمیٰ بہ "سروش سخن" جس کو ان کی رائے سے درست کرنے کا اتفاق ہوا، سب حال آپ سے بیان کیا تھا۔ چوں کہ اس قصے کو چھپنا چاہیے اور لکھنؤ بھیجنا منظور نہیں، اس کے سوا حضور سے بڑھ کر کون ہے، اس لیے وہ قصہ بھیجتا ہوں۔ حضور اس کو میری تصنیف سمجھ کر بہ نظر تامل بنائیں کہ بڑا مقابلہ ہے۔ اور طبیعت ان کی اچھی ہے۔ چنانچہ آج ہی ایک غزل میرے پاس پٹنہ میں اصلاح کو آئی ہے۔ اس کا ایک شعر میرے دل میں کھب گیا، وہ یہ ہے:

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پہ
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

اور قصے کو جلد ملاحظہ فرما کر عنایت فرمائیے۔"

غالب نے صفیر کے اس خط کا مندرجہ ذیل جواب دیا۔ یہ خط بھی "انشاے سبدگل" (ص ۲۱-۲۰) میں شامل ہے:

مکتوب غالب (۵):

"نور الابصار، ممتاز روزگار، زکی وارشد مولوی سید فرزند احمد طال بقاؤہ و زاد علاؤہ اس پیر ہفتاد سالہ کی دعا پہنچے . . . . (کذا) آج میں نے لیٹے لیٹے حساب کیا، یہ سترواں برس مجھے جاتا ہے، ہائے:

سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

نامۂ محبت افزا کو دیکھ کر آنکھوں میں نور، دل میں سرور آیا اور قصہ "سروش سخن" اس کے دوسرے دن پہنچا . . . [1] "ابھی کچھ بات کر نہیں آتی" کا جواب باصواب

---

[1] کرم خوردگی کی وجہ سے چند الفاظ ضائع ہو گئے۔

پایا۔

تم سلامت رہو قیامت تک
صحت و زور طبع روز افزوں

مگر ایسی باتوں سے بچنا مناسب ہے۔ گو مجھی سے ہو۔ شاعر پابند قواعد ہیں کچھ قواعد حسبِ خواہش شاعر نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ (کذا) مضمون بندی کا کام ہے۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ [1] مگر قواعد شاعر نہیں کہلاتا۔ الحمد للہ تم وقوف سے خالی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کذا)

قصہ دیکھا۔ آپ کے جوہرِ طبع کی لمعانی اور نیرّ فکر کی درخشانی بہت جگہ پر پسند آئی۔ اگرچہ وہ قصہ تو بچوں کے سلانے کی کہانی ہے مگر محنت کی گئی ہے۔ ہاں اگر 'فسانۂ عجائب' کا مقابلہ کیا ہے تو کیا کہوں کہ کیا کہا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں' آیندہ اس کی کیفیت سے اطلاع دی جائے گی۔ الفاظ کی غلطی بہت پائی جاتی ہے۔ جابجا 'لاچار' لکھا ہے اور 'لاچار' غلط ہے، کس لیے کہ چار لفظ فارسی ہے اور جیم فارسی اس کی دلیل ہے۔ اگرچہ "لا" عربی کا حرف نفی ہے مگر فارسی کا حرف نفی ہوتے کہ حرف "نا" ہے، "لا" کا لگانا کاتب کی جہالت ہے۔ یہ قصہ آپ کے خط سے نہیں معلوم ہوتا۔ شاید کسی کاتب سے لکھوایا ہے۔ ہائے خدا کی مار کاتبانِ ناہنجار پر۔ میرا دیوان اور پنج آہنگ اور مہر نیم روز ستیاناس کر کے چھوڑ دیا۔ غزلیات فارسی اصلاح ہو کر جاتی ہیں۔ لو بس، اب میں نواب ضیاء الدین خاں سے باتیں کر رہا ہوں۔ تمھارے خط کے جواب نے اتنی دیر اُن کو چپکا بٹھا رکھا، اور وُہ بھی تم کو سلامِ اشتیاق آمیز پہنچاتے ہیں اور منشی صاحب بہت بہت

---

[1] چند لفظ ضائع ہو گئے۔

بندگی کہتے ہیں۔"

صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط "متنازع فیہ" ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ صفیر کے پوتے سید وصی احمد بلگرامی مرحوم نے رسالہ "ندیم" گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ء میں "س ش ص" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اس میں انھوں نے صفیر کے خط کا ایک حصہ ("ملازمت" ۔۔۔۔۔ تا ۔۔۔ "شباب کے بدلے") نقل کیا اور غالب کا خط بھی درج کیا، لیکن اس کے بعض الفاظ حذف کر کے متعلقہ مقامات پر نقطے لگا دیے۔ رسا ہمدانی نے غالب کا خط "نادر خطوط غالب" (ص ۵۸ - ۵۷) میں نقل کیا۔ انھوں نے یہ خط "س ش ص" سے اخذ کیا اور سید وصی احمد کے پیش کردہ متن سے نقطے حذف کر کے عبارت کو مسلسل کر دیا۔ نیز شروع میں مقام و تاریخ (دہلی، ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء) کا اور آخر میں "نجات کا طالب غالب" کے الفاظ کا اضافہ کر دیا۔

قاضی عبدالودود صاحب نے صفیر و غالب کے مذکورہ دونوں خطوط کو جعلی قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں نے نادر خطوط غالب کے تبصرے میں جو معاصر پٹنہ میں شائع ہوا تھا، موصوف (سید وصی احمد بلگرامی) سے دریافت کیا تھا کہ صفیر و غالب کے خط انھیں کہاں سے ملے؛ لیکن انھوں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ یہ دونوں خط میری رائے میں جعلی ہیں اور جعل سازی کی غرض یہ ثابت کرنا ہے کہ سخن، صفیر کے شاگرد تھے ۔۔۔۔۔ صفیر کے خط میں دہلی جانے اور وہاں غالب سے سخن کے متعلق گفت گو آنے کا ذکر ہے۔ صفیر اوائل ۱۲۸۲ھ میں دہلی گئے ہیں ۔۔۔۔ وہاں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے ہیں ۔۔۔ اس سے لازم آتا ہے کہ خط دہلی سے واپسی کے بعد کا ہو۔ غالب کے خط میں جوان کی عمر کا ذکر ہے اس سے اس کا زمانۂ تحریر ۱۲۸۲ھ ثابت ہوتا ہے لیکن سروش سخن

(قطعات تاریخ طبع اور تاریخ دتاسی جلد ۲ ص ۱۷۱) ۱۲۸۱ھ[1] میں لکھنؤ کے مطبع نول کشور نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ یہ خط اس کے بعد لکھے گئے ہیں۔ جعل کسی ایسے شخص نے بنایا ہے جو سروشِ سخن طبع اوّل کے سالِ انطباع سے ناواقف ہے۔ اور اسی بنا پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار صفیر نہیں۔ یہ مستبعد ہے کہ وہ اسے نہ جانتے ہوں۔"[2]

غالب و صفیر کے خطوط "انشاے سبد گل" میں شامل ہیں جو ۱۲۸۹ھ میں چھپنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خطوط ظاہر ہے کہ صفیر کی زندگی میں طبع ہوئے اور جیسا کہ قاضی صاحب نے لکھا ہے صفیر سے یہ بعید ہے کہ وہ "سروشِ سخن" کی طبع اوّل سے واقف نہ ہوں۔ اگر ان خطوط کو جعلی قرار دیا جائے تو اس کے ذمہ دار صفیر ہی قرار پاتے ہیں، کوئی دوسرا نہیں۔ لیکن صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلے کو صفیر و سخن کے تعلقات کے پس منظر میں سمجھا جائے۔

سخن ۱۲۷۵ھ میں آرہ آئے اور یہیں انھوں نے ۱۲۷۶ھ میں "سروشِ سخن" لکھی۔ ابتدا میں صفیر و سخن میں نہایت خوشگوار تعلقات تھے جو بعد میں خراب ہو گئے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ "سروشِ سخن" کی تالیف میں صفیر کے مشوروں کو بھی دخل تھا۔ اسے خود سخن نے بھی تسلیم کیا ہے، لیکن ایسے انداز میں کہ جس سے صفیر کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے (تنبیہہ صفیر بلگرامی، ص ۸۹-۸۷)۔ اگر سخن ہی کے بیان کو لیا جائے تو صفیر و سخن کے جھگڑے کا آغاز "سروشِ سخن" کی طباعت سے

---

[1] ۳ شعبان ۱۲۸۱ھ تک یہ کتاب طبع نہیں ہوئی تھی۔ "انشاے سبد گل" میں ریاض الدین احمد آرزو کا ایک خط شامل ہے (ص ۳۷) جس میں یہ لکھا ہے کہ منشی نول کشور یکم جنوری ۱۸۶۵ء (مطابق ۳ شعبان ۱۲۸۱ھ) تک یہ کتاب چھاپ کر خواجہ سخن کو بھیج دیں گے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "سروشِ سخن" اواخر ۱۲۸۱ھ یا اوائل ۱۲۸۲ھ میں طبع ہوئی ہو گی۔

[2] "غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام"۔ ماہنامہ "آج کل" دہلی، اگست ۱۹۵۲ء، ص ۱۷۔

کچھ عرصہ پہلے ہوتا ہے۔ صاحب تنبیہہ صفیر بلگرامی کے قول کے مطابق، صفیر نے "سروش سخن" کا مسودہ صاف کیا تھا، دورانِ کتابت وہ اس میں اپنے اشعار درج کرتے چلے گئے، جنھیں سخن نے بعد میں خارج کر دیا اور صرف دو چار شعر رہنے دیے۔ صفیر نے "سروش سخن" کی تین نقلیں تیار کی تھیں۔ ایک نقل کسی دوسرے صاحب نے تیار کی تھی۔ ممکن ہے یہی آخری نقل صفیر نے غالب کو بھیجی ہو۔ خیال ہے کہ غالب کے ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کے خط کا جواب جو صفیر نے لکھا، "انشاے سبد گل" میں شامل کرتے وقت اس کا "سروش سخن" سے متعلق حصّہ تبدیل کر دیا گیا ہے، جس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخن پر یہ واضح کیا جائے کہ صفیر کو "سروش سخن" کی تصنیف ہی سے نہیں طباعت سے بھی دلچسپی تھی۔ یعنی اس خط کا آخری پیراگراف (ملازمت کے وقت . . . . تا . . . . عنایت فرمائیے) بعد کا اضافہ ہے۔ اصل خط میں صرف "سروش سخن" کے بھیجنے اور اپنی محنت کا ذکر ہو گا جسے حذف کر دیا گیا۔ اس خیال کو غالب کے جواب سے بھی تقویت پہنچتی ہے۔ صفیر کے خط کے آخری پیراگراف میں "سروش سخن" کی طباعت کے لیے مدد چاہی گئی ہے اور یہی صفیر کا اصل مقصد معلوم ہوتا ہے، لیکن غالب کے جواب میں اس کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ صفیر کی محنت کی تعریف کی گئی ہے۔ اگر غالب کے نام اصل خط میں طباعت کا مسئلہ اٹھایا گیا ہوتا تو وہ ضرور اس کا ذکر کرتے۔ صفیر کو آرہ و پٹنہ میں طباعت کی سہولتیں میسر تھیں، اور اس وقت تک ان کی کئی کتابیں چھپ چکی تھیں۔ ایسی صورت میں ان کا "سروش سخن" کی طباعت کے لیے غالب سے مدد طلب کرنا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ صفیر کے مذکورہ خط کے آخری پیراگراف کے سوا باقی خط کو جعلی قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس میں غالب کے خط مکتوبہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کی باتوں کا جواب ہے۔

قاضی صاحب نے غالب کے خط کے جعلی ہونے کے سلسلے میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ اس میں غالب نے اپنی عمر کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اس کا زمانہ تحریر ۱۲۸۲ھ ثابت ہوتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ خط ۲۵ ذی قعدہ اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کے درمیان کا ہے۔ ۸ رجب ۱۲۸۱ھ کو غالب اپنی زندگی کے ۶۹ سال پورے کر چکے تھے، اور اب ان کا یہ کہنا "یہ سترواں

برس مجھے جاتا ہے"۔ بالکل درست ہے۔ ان خطوں کو مشکوک قرار دینے کی سب سے بڑی وجہ صفیر کے خط کا آخری پیراگراف ہے جس میں انھوں نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر کر دیا ہے۔ "انشاے سبدگل" کی طباعت کا آغاز ۱۲۸۹ھ میں ہوا۔ غالب سے ان کی ملاقات کو سات برس گزر چکے تھے، اس لیے انھوں نے بے دھیانی میں اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے غالب سے ملاقات کے ذکر کا اضافہ کر دیا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سخن اور صفیر کے تعلقات اب پہلے جیسے خوشگوار نہیں رہے تھے اور سخن، صفیر کی شاگردی سے منحرف ہو چکے تھے۔ صفیر نے سخن کو اپنا شاگرد قرار دینے کے سلسلے میں اپنے ہی خط میں اس پیراگراف کا اضافہ کر دیا۔

اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ صفیر کے خط کے مذکورہ پیراگراف کے سوا صفیر و غالب کے خطوں میں کوئی عبارت ایسی نہیں ہے جسے جعلی قرار دیا جا سکے۔ مکتوب غالب کے جعلی ہونے کے خیال کو اس امر سے بعد میں تقویت پہنچی کہ اسے جعلی خطوط (نادر خطوط غالب) کے ایک مجموعے میں شامل کیا گیا۔

غالب کے خط کا صفیر نے کیا جواب دیا؟ یہ معلوم نہ ہو سکا لیکن صفیر کی بیاض میں پانچ شعروں کی ایک غزل ملتی ہے جس کا مطلع یہ ہے:

بہار آئی ہے اے ابر نوبہار برس
میں بار بار ہوں روتا تو بار بار برس

اس غزل کے آخری دو شعر یہ ہیں:

سنا صفیر یہ کہتے ہیں حضرت غالب
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس
مگر یہ پہلے سے اعداد غین کی ہے دعا
خدا کرے مرا غالب جیے ہزار برس

یہ واضح ہے کہ یہ قطعہ غالب کے اس شعر کے جواب میں کہا گیا تھا، جو

انھوں نے مذکورہ خط میں اپنی عمر کے سلسلے میں لکھا تھا۔

غالب کا جواب آنے کے بعد صفیر نے دو خط لکھے، جن میں سے پہلے میں مذکورہ قطعہ یا پوری غزل لکھی ہو گی۔ یہ دونوں خط دستیاب نہیں ہو سکے، ان کا ذکر غالب نے مندرجہ ذیل خط میں کیا ہے اور یہی غالب کا صفیر کے نام آخری خط ہے۔ یہ خط پہلے "مرقع فیض" (ص ۸۴) میں اور بعدازاں "جلوۂ خضر" (جلد دوم، ص ۲۵-۲۲۴) میں چھپا:

مکتوب غالب (۶):

"نورچشم و سرور دل، فرزانۂ مرتضوی گہر، مولوی سید فرزند احمد صاحب زاد مجدہٗ۔ اس نسبتِ عام سے کہ ہم اور آپ مومن ہیں سلام اور اس نسبتِ خاص سے کہ آپ میرے دوستِ روحانی کے فرزند ہیں دُعا اور اس نسبتِ اخص سے کہ آپ میرے خداوند کی اولاد میں سے ہیں بندگی:

میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

آپ کے دو خطوں کا جواب بسبیلِ ایجاز لکھا جاتا ہے: دُہائی خدا کی مجھے ولایت کی اپیل کی تاب نہیں، نہ تم ایپیلانٹ بنو، نہ مجھے رسپاڈنٹ[1] بناؤ۔ لکھ بھیجو کہ "صبح بہار" کی عبارت فارسی ہے یا اردو اور ماکتب فیہ اس کا کیا ہے؟

نجات کا طالب، غالب[2]

چہار[3] شنبہ، ہفتم ذی الحجہ، ۱۲۸۱ ہجری"

---

[1] جلوۂ خضر: رسپانڈنٹ

[2] "نجات کا طالب" کے الفاظ "جلوۂ خضر" میں نہیں ہیں۔

[3] جلوۂ خضر: چار

غالب وصفیر کی ملاقات

غالب کے، ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ کے خط کے بعد صفیر و غالب کی مراسلت کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ۱۲۸۲ھ کے اوائل میں صفیر دہلی گئے اور وہاں انھوں نے غالب سے ملاقات کی۔ وہ دہلی میں دو ڈھائی مہینے ٹھہرے۔

صفیر نے غالب سے اپنی ملاقات کا ذکر اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پہ کیا ہے۔ ان بیانات میں سفرِ دہلی کے بارے میں مختلف سنین ملتے ہیں۔ "رشحات صفیر" میں وہ لکھتے ہیں:

"۔۔۔۔ میں نے اس رسالے (رشحاتِ صفیر) کو جب درست کیا تو میں ۱۲۸۰ھ میں حضرت غالب کی ملازمت کو دہلی گیا اور شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ اس رسالے کا مسودہ میرے ساتھ تھا، حضرت نے اپنی چشمِ عنایت سے ملاحظہ فرمایا اور اس کی تقریظ لکھ کر عنایت کی جو "عود ہندی" میں چھپی ہے۔" (ص ۱۴۳)

"جلوۂ خضر" (جلد اوّل، ص ۲۱۶) میں مفتی صدرالدین آزردہ کے حال میں لکھتے ہیں:

"مولفِ کتاب [صفیر] ۱۲۸۳ھ میں جب حضرت غالب کی ملازمت کے واسطے دہلی گیا تھا، ان کی خدمت سے بھی فیض یاب ہوا تھا۔"

جلد اول ہی میں صاحب عالم کے ذکر میں (ص ۲۰۰) دہلی جانے کا سنہ ۱۲۸۳ھ بتایا ہے۔ اسی جلد کے ص ۲۲۲ پر انھوں نے یہ سنہ ۱۲۸۲ھ لکھا ہے اور پھر "جلوۂ خضر" (جلد دوم) میں اپنے حالات لکھتے ہوئے ص ۱۸۰ پر کہا ہے:

"۱۲۸۳ھ میں پینتیسویں برس فارسی پر توجہ ہوئی، دہلی جاکر حضرت غالب کی شاگردی کی۔"

اسی جلد کے صفحہ ۲۱۶ پر یہ بتایا ہے:

"۱۲۸۲ھ میں محرم کے آخر مہینے میں حضرت [غالب] کی ملازمت کے لیے دہلی گیا اور دو ڈھائی مہینے حاضر رہ کر بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔"

"طبقات کرام موسوم بہ سادات بلگرام" میں صفیر نے اپنی خودنوشت سوانحعمری کے آخر میں لکھا ہے:

"۱۲۸۲ھ میں مارہرے ہوتا ہوا حضرت غالب کی ملاقات کے لیے دہلی روانہ ہوا۔"
(قلمی، ص ۴۱۷)

"محشرستان خیال" میں بھی ۱۲۸۲ھ لکھا ہے۔ (ص ۲۶)

گویا صفیر کے اپنے بیانات کے مطابق سفر دہلی ۱۲۸۰ھ، ۱۲۸۲ھ اور ۱۲۸۳ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ صفیر ایک سے زائد مرتبہ دہلی نہیں گئے۔ ۱۲۸۱ھ کے آخر تک صفیر کا آرہ میں مقیم ہونا ثابت ہے، کیونکہ غالب کا آخری خط، ذی الحجہ، ۱۲۸۱ھ کا ہے جو صفیر کو آرہ میں ملا۔ ۱۲۸۳ھ میں بھی صفیر آرہ میں تھے اور اس کا ثبوت غالب کا وہ خط ہے جو صاحب عالم مارہروی کے نام ۲۶ راگست ۱۸۶۶ء (۱۴ ربیع الآخر، ۱۲۸۳ھ) کو لکھا گیا تھا اور جس میں صفیر کا ذکر ہے اور یہ صریحاً لکھا ہے کہ وہ پٹنے میں موجود ہیں۔ صفیر بقول خود محرم کے آخر میں دہلی گئے اور دو ڈھائی مہینے وہاں رہے۔ اس لیے ۱۴ ربیع الآخر تک دہلی میں ان کا رہنا لازم ہے۔ غالب کے مذکورہ مکتوب سے پہلے صاحب عالم کو رشحات صفیر کا دیباچہ مل چکا تھا اور وہ اسے صفیر کے پاس بھیج چکے تھے۔ یہ سب کچھ ۱۴ ربیع الاول سے پہلے ہوا۔ اگر

صفیر ۱۲۸۳ھ کے اوائل میں دہلی میں ہوتے تو دیباچہ صاحبِ عالم کو کیوں بھیجا جاتا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صفیر نے ۱۲۸۳ھ میں غالب سے ملاقات نہیں کی۔ اب ۱۲۸۲ھ ہی ایسا سال رہ جاتا ہے جس میں صفیر کا سفرِ دہلی اختیار کرنا یقینی ہے۔

غالب سے ملاقات کا حال صفیر نے تفصیل کے ساتھ "جلوۂ خضر" جلد اول کے جلوۂ پنجم میں (ص ۲۲۸ - ۲۱۸) بیان کیا ہے۔ صفیر نے غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، وُہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

غالب علیہ الرحمۃ :

"اسد اللہ خان عرف مرزا نوشہ، اکبر آبادی مولداً، دہلی مسکن، المخاطب بہ نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ۔ یہ وہ خوش مذاق شخص گزرا ہے جس نے ہندوستان کی فارسی شاعری اور اردو نثر کو تجدید کا خلعت عطا کیا۔ میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پہ ولایتی فارسی کا یقین چار شخصوں کے کلام پہ ہوا؛ اوّل امیر خسرو، دوم حسن دہلوی، سوم مرزا بیدل، چہارم غالب۔ اگرچہ ناصر علی سہرندی اور مرزا جانجاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خان آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فرہاد، یہ سب کے سب خوشگو اور شاعرِ بے بدل تھے مگر جامۂ ایجاد جو خداداد ہے، انہیں چاروں کے راست قامت پہ راست آیا۔ اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے ہیں، ان پہ بھی نغز گفتاری کا خاتمہ ہوا۔ گو ان کے سوا اور بھی شعرائے فارسی ہندوستان میں ہوئے ہیں مگر ان لوگوں کی خوبیوں کو نہیں پاتے۔ اور یہ لوگ ان چاروں کی شہرت ایجاد نہیں حاصل کر سکتے۔ یہ تو خدا کی دین ہے۔

اہلِ مذاق باانصاف میرے اس لکھنے کا بُرا نہ مانیں۔ میرا خاندان سلسلہ وار صاحبِ علم و شاعر گزرا ہے۔ سید خورشید علی خورشید تخلص میرے پر دادا کے والدؔ اور سید بندہ علی بندہ میرے پر دادا۔ سید غلام یحییٰ یحییٰ تخلص میرے دادا۔ حضرت صاحب عالم میرے نانا۔ یہ سب کے سب فارسی کہنے والے اور بڑے بلند خیال تھے۔ اسی طرح بلگرام میں بہت

شعرائے فارسی اپنا ڈنکا بجا گئے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے علامہ عبدالجلیل بلگرامی کو بھی کہ نعمت خان عالی کے ہم عصر اور ہم طرح وقائع میں تھے، شمار نہیں کیا کیونکہ یہ لوگ اور پایہ رکھتے تھے۔ غرض میرے نزدیک آغاز امیر خسرو سے ہوا اور انجام غالب دہلوی پر ہُوا۔ ہندوستان کی فارسی کا کہ شمس الدین فقیر دہلوی کے وقت سے ایک طرزِ خاص سلاست آمیز شروع ہوا تھا، رنگ ہی بدل دیا اور بڑی ہمت کر کے فارسی کو پھر ولایت کی کرسی پر بٹھایا، ان کے کلام سے ظاہر ہے۔ اردو نظم بھی ایک طورِ خاص کی کہی، اس میں بھی ایجادِ خاص ہے۔ آخر میر تقی کا رنگ بالکل اتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پر توجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اس کو بلند کر دیا، یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی اور نہ دہلی کی۔ دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی، یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ہندی اکثر شعروں میں نہیں آیا۔ مثلاً:

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

اس میں "آیا" کی جگہ "آمد" اور "مانگے" کی جگہ "طلبد" بنا دو تو فارسی کا مطلع اور شعر ہے۔ اسی پہ حضرت نے فرمایا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مگر جب دقیقہ سنجوں نے حضرت کے اشعار کو بے معنی کہنا شروع کیا تو حضرت نے فرمایا:

نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اس پر بھی لوگوں نے اکتفا نہ کی اور زبانی حضرت سے کہا کہ آپ مشکل پسندی کو چھوڑ دیجیے۔ چنانچہ اس کا ذکر جناب آزاد نے آبِ حیات میں کیا ہے۔ اس وقت حضرت نے یہ رباعی کہی:

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

آخر اپنے دیوان کو منتخب فرمایا اور کوئی بیس جزو کا چار جزو پر دار و مدار رکھا اور یہ شعر فرمایا:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رُسوا کیا مجھے

یعنی حضرت کا مذاقِ خاص اُس انتخاب سے معلوم ہوگیا۔ واقعی انتخاب وہ کیا کہ اب اُس سے زیادہ انتخاب نہیں ہو سکتا اور اس انتخاب کے بعد سے میر تقی میر کے طرز کو اختیار کیا اور آغاز اس کا اس شعر سے کیا:

غالب اپنا بھی[1] عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

اس پر ذوق نے طعن سے کہا بھی:

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

مگر حقیقت میں میر کا انداز جو کچھ برتا تو غالب ہی نے برتا۔ اگرچہ میر تقی کی زبان کی مناسبت تو نہیں ہے کیونکہ ان کے وقت میں زبان بہت کچھ صاف ہو چکی تھی،

---

[1] صحیح: یہ

مگر بندش اور الفاظ کی چستی او ردرستی بالکل میر کی ہے، مگر کبھی میر سے انحراف نہ کیا۔ شوخیٔ طبع سے اگر کہا بھی تو یُوں کہا :

ریختہ کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذوقؔ کو ان سے کچھ مناسبت نہیں تھی۔ چنانچہ فارسی کے دیوان میں قطعات حضرت غالب کی اسی غیر مناسبت کی دلیل ہیں اور جناب آزاد نے بھی آب حیات میں اس کا اشارہ کیا ہے۔ اردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انھیں کا ہے، ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ اُردوے معلّٰی اُنھیں جواہر بھرے خطوط کا مخزن ہے جس میں اس نئے ایجاد کا رنگ ہے۔ بعد طبع اردوے معلّٰی چودھری عبدالغفور صاحب سرورؔ مارہروی نے کہ حضرت غالب کے شاگرد تھے اور مرید حضرت صاحبِ عالم صاحب مولف کے نانا کے تھے، وہ خطوط اردو حضرت غالب کے جو اُن کے نام اور جناب نانا صاحب کے نام اور لوگوں کے نام آئے تھے، جمع کرکے اس کا نام "عود ہندی" رکھا۔ جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارہرہ ہو کر دہلی گیا تھا، وُہ انشا مرتب ہو رہی تھی۔ چنانچہ اس مسودے کی نقل میں اپنے ساتھ بھی لایا تھا۔ اب تو وُہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چونکہ بعد اس کے میرے پاس آرہ اور پٹنہ میں آئے تھے، وہ اس ترتیب میں داخل ہونے سے رہ گئے[1]۔ مگر ایک تقریظ رسالہ "رشحات صفیر"

---

[1] یہ درست نہیں ہے۔ صفیر کے نام تمام خطوط ۱۲۸۱ھ تک کے ہیں۔ ان کا غالب کے کسی مجموعے میں شریک نہ ہونا تعجب خیز ہے اور وہ بھی اس صورت میں جبکہ یہ خطوط مرتب ہو رہے تھے تو صفیر دہلی میں تھے۔ صفیر کا یہ بیان بھی درست نہیں کہ "اردوے معلّٰی" پہلے چھپی اور "عودِ ہندی" بعد میں۔ "عود ہندی" ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (مطابق ۲۷ راکتوبر ۱۸۶۸ء) کو شائع ہوئی اور "اردوے معلّٰی" ۶ مارچ ۱۸۶۹ء (مطابق ۲۱ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ) کو شائع ہوئی۔ صفیر نے سرور کو عود ہندی کا مرتب قرار دیا ہے، یہ بھی درست نہیں۔ "عود ہندی" کی پہلی فصل سرور کی مرتبہ ہے، جس کا نام "مہرِ غالب" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب باتیں صفیر نے متعلقہ کتابوں کو پیش نظر رکھے بغیر حافظے سے لکھی ہیں۔

المشہور بہ "فیض صفیر" تانیث تذکیر کی اُس میں چھپی ہے۔ تشریح اس نثر اردو کی ان شاء اللہ تعالیٰ تذکرۂ نثر اردو میں کی جائے گی۔

"حضرت غالب کا حال کمال شہرت سے محتاج بیان نہیں اور جناب آزاد نے "آبِ حیات" میں بہت مشرح مع لطائف کے سب کچھ لکھا ہے۔ مجھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں بھی مختصر کیفیت اپنی ملازمت اور شاگردی کی یہاں لکھ دوں۔ وہ بھی لطائف سے خالی نہیں۔

مولف کا دہلی جانا اور حضرت غالب سے شاگردی کا خلعت پانا

"۱۲۸۰ھ میں بندہ سید فرزند احمد صفیر اپنی دُوسری شادی کے واسطے بلگرام گیا اور بعد شادی کے اپنے نانا حضرت صاحب عالم صاحب سجادہ نشین مارہرہ ضلع ایٹہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رستے میں فرخ آباد پڑا، وہاں جناب ڈپٹی کلب حسین خاں بہادر نادر سے ملاقات کا[1] لطف اٹھایا۔ جب مارہرہ پہنچا اور نانا صاحب کی خدمت سے فیض یاب ہوا، وہاں حضرت غالب کا چرچا اور ان کا ذکر بہت پایا۔ نانا صاحب سے اور ان سے ایک ربط خاص تھا مگر لطف یہ ہے کہ ملاقات کی نوبت عمر بھر نہ آئی۔ میں نے خواہش ظاہر کی کہ حضرت غالب کا شاگرد ہوں اور ایک عریضہ مع دو غزل فارسی اور دو غزل ہندی کے مارہرے سے روانہ کیا۔ حضرت غالب نے اس کے آٹھویں دن ایک جلد مثنوی ابر گہر بار کی اور جواب میرے خط کا مجھے بھیجا۔ میں نے ایک مخمس قدسی کی غزل پہ بہ فرمائش تفضل حسین خاں (جنھوں نے نعت کہنے والوں کا تذکرہ جمع کیا تھا) مارہرے میں کہا تھا، اس کو حضرت غالب کے پاس اصلاح کے لیے بھیج کر بلگرام آیا اور وہاں سے آرے پہنچا۔ حضرت غالب نے اُس مخمس پہ ایک جگہ مقطع میں اصلاح دے کر بھیج دیا۔ جب میں نے "بوستانِ خیال" کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ اودھ اخبار مشتہر ہُوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے

---

[1] اصل: "کی" جو سہو کتابت ہے۔

پاس پٹنہ میں بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی، اُس وقت سے خط و کتابت رہی۔ یہاں تک کہ حضرت کے اشتیاق نے ۱۲۸۲ھ میں بے اختیار مجھے آرے سے دہلی چلنے کی تحریک کی اور بے شان گمان مارہرے پہنچا اور وہاں سے اپنے منجھلے ماموں حضرت شاہ عالم کے ساتھ مع چند ملازموں کے روانۂ دہلی ہوا۔ آموں کا موسم تھا، ناناصاحب نے اپنے باغ کے آم ایک ٹوکرا بھر کے قریب دو ہزار کے میرے ساتھ کر دیے۔ میں علی گڑھ سے دہلی روانہ ہوا۔ دس بجے شب کو دہلی پہنچا۔ شب جمنا پار لال قلعے کے نیچے بسر کی، صبح کو جامع مسجد کو باہر سے دیکھتا ہُوا محلّہ بَلّی ماراں میں حضرت غالب کے پاس پہنچا۔ حضرت برآمدے میں بیٹھے کلی پی رہے تھے۔ ماموں صاحب بھی حاضر ہُوئے، دیکھ کر بشاشں ہو گئے۔ اس کے بعد میں سامنے موجود ہُوا، پُوچھا یہ کون ہیں؟ میں نے عرض کی صفیر۔ ماموں صاحب نے کہا میرا بھانجا۔ بولے ذرا ٹھہر جائیے۔ یہ کہہ کر بدقت ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اُٹھے اور بغل گیر ہوئے اور برآمدے سے اندر آ کر بیٹھے، گرمی کے دن تھے، صفر کا مہینہ تھا۔

"حضرت کا لباس اس وقت یہ تھا: پاجامہ سیاہ بوٹے دار دریس کا کلی دار، نیفہ سرخ ٹول کا، بدن میں مرزائی، سر کھلا ہوا، رنگ سرخ سفید، منہ پر داڑھی دو انگل کی، آنکھیں بڑی، کان بڑے، قد لمبا، ولایتی صورت۔ پاؤں کی انگلیاں بہ سبب کثرت شرب کے موٹی ہو کر اینٹھ گئی تھیں اور یہی سبب تھا کہ اُٹھنے میں دقت ہوتی تھی۔ آنکھوں میں نور موجود تھا۔ کان کی سماعت میں کچھ ثقل آچلا تھا۔

"الغرض اندر آکر بیٹھے۔ بعد مزاج پرسی کے ناناصاحب کو بہت پوچھا اور کہا افسوس کوئی سبب ایسا نہیں ہوتا جو حضرت کی ملازمت کروں۔ اتنے میں نواب ضیاء الدین خاں بھی تشریف لائے، حضرت نے مجھے ان سے ملایا۔ وہ بھی وجیہ آدمی رئیسوں کی وضع پر تھے، کُرتا پہنے، خلط دار پاجامہ، سر پر ٹوپی، جریب ہاتھ میں۔ بعد اس کے حضرت نے ان سے میرا حال کہا اور فرمایا یہ میری ملاقات کو آرے سے آئے ہیں۔ اس کے بعد کچھ ان سے سرگوشی

ہوئی۔ جب وُہ اُٹھ گئے اور دوپہر قریب ہُوئی تو حضرت اُٹھے اور مجھے اور میرے ماموں صاحب کو اپنا تمام مکان دکھایا۔ ہر جگہ کا نشان دیتے جاتے تھے کہ یہ مقام فلاں کام کے لیے ہے اور یہ فلاں کام کے واسطے۔ آخر زینے کے پاس آئے اور چھت پر چلے۔ ہم لوگ بھی ساتھ تھے۔ اوپر جاکر دیکھا تو بہت بڑی چھت تھی اور اس کے کونے پر ایک کمرہ گلی کے رُخ بنا ہوا تھا۔

لطیفہ :

"فرمایا، میں بلا مبالغہ کہتا ہُوں کہ یہاں آدھی رات تک دُھوپ رہتی ہے۔ یہ کہہ کر ہنسے اور بولے آپ سمجھے! میں نے کہا سمجھا، یعنی گرمی کے دن ہیں۔ دہلی کی گرمی اور تمازتِ آفتاب سے در و دیوار اس قدر جلتے ہیں کہ آدھی رات تک ان کی گرمی فرو ہوتی ہے۔ الغرض پھر کوٹھے کے نیچے آئے اور فرمایا" اس مکان کے دکھانے سے میرا مطلب یہ تھا کہ میرے مکان میں گنجائش نہیں اور آپ مہمان عزیز ہیں۔ اس لیے ضیاء الدین خاں صاحب کا مکان جو جامع مسجد کے قریب ہے، آپ کے واسطے تجویز ہوا ہے۔ گو تھوڑا سا دور ہے مگر آرام بہت ملے گا۔ میں نے عرض کی مجھے حضوری ضروری ہے، فرمایا کچھ ایسا دور نہیں ہے۔ یہ کہہ کر اپنے ایک رفیق کو بلایا اور میرے ساتھ کیا۔ ہم لوگ اُس مکان میں پہنچے۔ وُہ مکان عالی شان تھا، ایک بڑا پھاٹک بر سرِ سڑک جس پر ایک بنگلہ خوشنما بنا ہوا، اس کے اندر ایک خانہ باغ تر و تازہ، اس کے بعد ایک ایوان عالی شان فرش و فروش سے آراستہ سجا سجایا، اس کی پشت پر محل سرا، دونوں بغلوں میں کمرے، غرض بہت خوش آب و ہوا مکان ملا۔ ہم لوگ سب چھ آدمی تھے، اس مکان کے ایک کونے میں سما گئے۔ الغرض ابھی اچھی طرح سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پانچ خوان جن پر خوان پوش خوشنما پڑے تھے، انھیں رفیق کے ساتھ آئے۔ معلوم ہوا کھانا ہے اور ایک خوان میں خوش رنگ و خوشبو تخمی آم تھے۔ میں نے خیال کیا کہ جب یہ آم خود ایسے ہیں، پھر میرے ساتھ کے آم بھیجنے کے قابل کب ہیں۔ الغرض کھانا کھایا، بہت مزیدار اور خوشگوار تھا۔ قورمہ، قلیہ، شیرمال، پلاؤ، زردہ، شیر برنج، متنجن کباب، پراٹھا سب کچھ تھا۔ بعد کھانے کے آم جو کھانے بیٹھا، صورت حرام نظر آئے، بالکل

کھٹے۔ میں پورب کے آم کھائے ہوئے تھا، بڑی نفرت ہوئی۔ اپنے ساتھ کے آم نکال کر کھائے، اس سے کہیں بہتر پائے، پھر تو میں نے نصف ٹوکرا حضرت غالب کی خدمت میں بھیجا۔ وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد ایک رباعی لکھ کر آئی جس کا آخری مصرع مجھے یاد ہے:

کھانا نہ اسے کہ یہ پرانے ہیں آم

اور سب آم منگا لیے۔ آم کا شوق حضرت کو بہت تھا۔ العرض شام کو میں پھر حاضر خدمت ہوا، آموں کی بہت تعریف کی۔ قریب مغرب میں فرودگاہ پر آیا۔ صبح کو "فیض صفیر رسالہ تانیث تذکیر" کا مسودہ لے کر گیا، حضرت نے خود لے کر اسے دیکھا اور بے عینک کے دیکھا۔ دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا اور بہت تعریف کی اور اس کی تقریظ لکھ کر مجھے دی جو اس رسالے کے ساتھ چھپی ہے اور 'عود ہندی' میں بھی موجود ہے۔ ہر روز کی ملازمت سے طبیعت بہت محظوظ ہوتی رہی ہے۔

"ایک دن قریب دوپہر کے پلنگڑی پر لیٹے ہوئے تھے اور میں قریب پٹی کے حاضر تھا۔ بولے کیوں حضرت برف کا پانی پیو گے؟ میں نے کہا اگر کوثر کا پانی پینا ہو تو پلوائیے۔ ہنس کر بولے ضرور، اور آدمی کو پکار کر کہا فلاں کنویں سے پانی لے آؤ۔ میں نے کہا حضور نے برف کا پانی کہا تھا۔ فرمایا برف ہی کا ہے۔ غرض پانی آیا، پیا، واقعی سرد تھا۔ فرمایا یہ ایک کنواں ہے جس کا پانی ایسا ہوتا ہے۔

"ایک دن ایک صاحب نے مجھے پوچھا اور مذہب کو استفسار کیا۔ ماموں صاحب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا منہم، اور میری طرف اشارہ کر کے فرمایا منّا۔

"ایک دن مرثیے کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے کہ میں نے بھی ایک مرثیہ شروع کیا تھا، تین بند کہہ کر دیکھا تو "واسوخت" ہو گیا۔ وہ بند یہ ہیں:

مرثیہ فرمودۂ حضرت غالب

ہاں اے نفس باد سحر شعلہ فشاں ہو

اے دجلۂ خوں چشم ملائک سے رواں ہو

اے زمزمۂ قم لبِ عیسٰی پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہِ معصوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہِ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ خرگہِ نُہ پایہ جو مدت سے بجا ہے[۱]
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے
کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا[۲]
کچھ اور ہی نقشا ہے دل و چشم و زباں کا[۳]
کیسا فلک اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا
ہو گا دلِ بیتاب کسی سوختہ جاں کا
اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے[۴]
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

---

[۱] دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بپا ہے ۔
[۲] ایضاً : کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا
[۳] ایضاً : کچھ اور ہی نقشا نظر آتا ہے جہاں کا
[۴] ایضاً : اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے

"پھر فرمایا[۱] واقعی یہ حق مرزا دبیر کا ہے، دُوسرا اس راہ میں قدم نہیں اٹھا سکتا۔

ایک دن فرمایا کہ آپ کہتے ہوں گے کہ غالب کچھ اچھی اچھی چیزیں کھاتا ہوگا اور میرے کھانے کے لیے معمولی پلاؤ، قورمہ، قلیہ، شیرمال وغیرہ بھیج دیتا ہے۔ آج آپ میرا کھانا دیکھیے۔ الغرض گیارہ بجے دن کو آپ کا کھانا ایک سینی میں آیا۔ ایک دسترخوان بچھایا گیا، اس پر ایک چینی کے پیالے میں شوربا اور ایک میں بھرا ہوا گھی گرم کیا ہوا، اور ایک تانبے کی رکابی میں پاؤ بھر گوشت کی بوٹیاں، اور ایک تانبے کی رکابی میں تین پھلکے روے کے، اور ایک رکابی تانبے کی خالی۔ پھر وُہ رفیق آکر بیٹھے، انھوں نے پھلکوں کے کنارے توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کیے، اور خالی رکابی میں رکھے، اور پھر ایک چمچے سے تھوڑا گھی اور تھوڑا شوربا لے کر ان ٹکڑوں کو ملایا اور خوب ملا کر حلوے کی طرح بنا کر دو لقمے کے انداز سے ایک طرف رکابی میں رکھ دیا۔ اتنے میں حضرت پلنگڑی سے اترے اور دسترخوان پر آ بیٹھے۔ پہلے وہ دونوں لقمے نوشِ جان فرمائے، اس کے بعد آدھا پیالہ شوربا اور آدھا پیالہ گھی کا پی گئے۔ البتہ آدھ سیر گھی سے کم نہ ہوگا۔ بعد اس کے پھلکوں کے دو پھلکے لے کر شوربا ملا ملا کر کھائے۔ اس پر پھر بقیہ گھی اور شوربا پی لیا اور کھا چکے، اور فرمایا بس میرا کھانا یہی ہے۔ شب کو پاؤ بھر بادام مقشر نمک میں تلوا کر کھا لیتا ہوں۔

"ایک دن نواب ضیاء الدین خاں نے میری دعوت کی۔ بہت تکلف سے کھانا کھلایا۔ میں ان کھانوں کی تعریف نہیں کر سکتا۔ بہت دیر تک باتیں ہوا کیں۔ ایک دن مولوی صدر الدین صاحب آزردہ کے پاس مجھے لے گئے۔ ان کے فیض سے بھی کامیاب ہوا۔

"ایک دن پنکھے کے میلے میں دس روپے دے کر اپنے عزیزوں کی طرح مجھے بگھی پر بھیجا۔ وہ میلا بھی[۲] قابل دید تھا، دہلی کا میلا کیا کہنا ہے۔ میں نے دہلی کی سیر خود اختیاری

---

[۱] گمان غالب ہے کہ صفیر نے شیخ ریاض الدین امجد کے سفرنامے "سیرِ دہلی" سے استفادہ کیا ہے۔ مرثیے کے ان بندوں کا متن "سیرِ دہلی" کے مطابق ہے۔ "سیرِ دہلی" میں غالب کا یہ قول بھی ملتا ہے "یہ حصّہ دبیر کا ہے۔ وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا ہے۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ ناتمام رہ گیا۔" (ص ۳۵)

بھی خوب کی۔ جامع مسجد کو دیکھا، سبحان اللہ کیا کہنا ہے۔ تبرکات کی زیارت کی۔ جناب امیر اور حسنین علیہم السلام کے دستِ مبارک کے قرآن لکھے ہُوئے دیکھے، خطِ کوفی میں تھے۔ چوک کی سیر روز کرتا تھا۔ بازاروں میں روز پھرتا تھا۔ مگر دہلی عجب مقام ہے، جہاں کسی کو کسی سے کام نہیں۔ چیزوں کی خریداری کرو، دام پوچھو، چیز لو، دام دو۔ کسی نے کبھی نہ پُوچھا کہ تم کون ہو، کہاں کے رہنے والے ہو۔ خواجہ امان صاحب مترجم بوستان خیال میری ملاقات کو چند بار تشریف لائے اور بہت تپاک سے ملے، دو مرتبہ مشاعروں میں بھی لے گئے، وہاں کی غزلیں میرے دیوان "خمخانہ" میں چھپی ہیں۔ چند شعر ان غزلوں کے یہ ہیں[1]

"غرض دہلی میں رہ کر خوب سیر کی، خوب لُطف اٹھائے۔ آخر رمضان ۱۲۸۲ھ تک آرے چلے آئے[2]۔ جب تک حضرت غالب کے ہوش و حواس درست رہے، خط و کتابت جاری رہی۔ آخر ۱۲۸۵ھ میں انتقال فرمایا۔

کلام معجز نظام ان کا فارسی اور اردو ہر جگہ موجود ہے مگر دو غزلوں میں سے کچھ لکھے دیتا ہوں۔ ایک وضعِ اوّل کی اور دوسری وضعِ ثانی کی[3]۔"

---

[1] اس کے بعد صفیر کی دو غزلوں کے اشعار ہیں۔

[2] صفیر بقول خود، محرم ۱۲۸۲ھ کے آخر میں دہلی پہنچے، اور دو ڈھائی مہینے وہاں رہے۔ دہلی میں ان کا قیام ربیع الثانی کے وسط تک رہا ہوگا۔

[3] اس کے بعد غالب کی دو غزلوں سے نہیں بلکہ تین غزلوں سے ۱۶ شعر درج کیے گئے ہیں۔ پہلے یہ مطلع ہے:

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر
تغیّر آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

اس کے بعد اسی غزل کا ایک شعر ہے، اور پھر یہ شعر ہے:

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی
گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر

اس کے بعد اس غزل کے مزید پانچ شعر درج کیے ہیں۔ تیسری غزل کا مطلع یہ ہے:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

صفیر نے دہلی کے قیام میں غالب سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ اوپر کے بیان میں پہلی ملاقات کی تفصیل اور چند دیگر ملاقاتوں سے متعلق واقعات درج ہوئے ہیں۔ مومن خاں مومن کے حالات لکھتے ہوئے بھی صفیر نے "جلوۂ خضر" جلد اول (ص ۲۴۰ - ۲۳۵) میں غالب سے ایک ملاقات کا حال ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"مجھ سے اور غالب علیہ الرحمۃ سے ایک مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی زبان کے بارے میں گفتگو ہوئی اور سبب اس کا یہ ہوا کہ اُن دنوں حضرت اپنے ایک رسالے[1] کا مسودہ اردو زبان کی تحقیق میں کاتب سے لکھوا رہے تھے۔ جو میں نے اس کے صاف شدہ اجزا ہاتھ میں لے لیے، حضرت نے دیکھ کر فرمایا، ہاں اس کو دیکھو، یہ ایک چیز میں نے ان دنوں بہ فرمایش ڈائرکٹر صاحب لکھی ہے۔ اس میں اردو کی مختصر تاریخ اور کچھ قواعد تھے، کوئی پانچ چھ جزو کا رسالہ تھا۔ جناب ڈائرکٹر صاحب نے مولف کے نانا حضرت صاحبِ عالم صاحب کو بھی خط لکھا تھا کہ زبان اردو کی تاریخ اور قواعد میں کوئی کتاب لکھ کر بھیج دیجیے۔ چناں چہ حضرت نے اس کا اہتمام میرے سپرد کیا تھا، مگر میں نے اس کا مسودہ درست کر کے بھیج دیا تھا، پھر خدا جانے کیا ہوا۔ اسی طرح حضرت غالب کو بھی لکھا تھا۔ وہ اسی رسالے کو لکھوا رہے تھے۔ الغرض اُسی رسالے کے پڑھنے میں کچھ دہلی لکھنؤ کی زبان کا ذکر آگیا۔ فرمایا، میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنؤ نے اور لکھنؤ میں ناسخ نے۔ ورنہ بولنے کو کون نہیں بول لیتا۔ اب جس کا جی چاہے تراش خراش روز کرے، مگر میرے نزدیک وہ تراش خراش کی جگہ ہی نہیں چھوڑ گیا ہے۔ ہاں قواعد لکھ نہیں گیا۔ قواعد جاننے والا اس کے کلام کے مزے پاتا ہے۔ ہماری دلّی

---

[1] اس سے مراد رسالہ "نکاتِ غالب" ہے جو "رقعاتِ غالب" کے ساتھ ۱۸۶۷ء میں چھپا تھا۔ صفیر کا یہ کہنا درست نہیں کہ یہ رسالہ اردو زبان کی تحقیق میں ہے۔ یہ "پنج آہنگ" کے آہنگِ چہارم کا ترجمہ ہے جو فارسی کے قواعد سے متعلق ہے۔

ہمیشہ اس بات میں پیچھے رہی کہ مضمون کے آگے زبان کی درستی نہ کی اور مضمون میں بھی عاشقانہ کا زیادہ خیال رہا، مگر یاد رہے اس مضمون میں ولی کے برابر میں کسی کو نہیں سمجھتا۔ پھر ہنس کر فرمانے لگے، اس زبان پر اس کے سوا اور ہوتا کیا۔ میں نے بھی ایک طرز خاص ایجاد کیا تھا، جس میں ہر طرح کے مضمون کو نشوونما ہو سکتا تھا، مگر یاروں نے چلنے نہ دیا۔ اور سچ پوچھو تو یہ ایجاد ناسخ کا ہے۔ میاں! جب ناسخ کا کلام دہلی میں پہنچا، جیسا تم نے ولی کے دیوان کا حال سُنا ہو گا کہ دلی میں آیا تو جیسے نئی چیز پر لوگ گر پڑتے ہیں، اُسی طرح اس کے کلام پر گر پڑے، اُس وقت فارسی کی شاعری دہلی میں بہت چمکی تھی، مگر اردو کی مداخلت فقط بول چال میں تھی، اس کو مسلسل نظم میں جو دیکھا تو نوخیز اور فارسی دان سب اس کی تقلید پر چلنے لگے اور ہر ایک نے اپنے اپنے معلومات کے مطابق رہ سپری کی۔ مگر وہ فقط زبان کو نظم کر دینا تھا، کچھ ایسی دقت نہ ہوئی۔ پھر بھی جتنے لوگوں نے ادھر توجہ کی، ہر ایک کی ایک طرز نئی ہو گئی۔ مگر ناسخ کے کلام نے (جس کو علم درکار تھا اور قاعدے کے پرتو پر ڈالا گیا تھا) دہلی میں آکر سب کو حیران کر دیا اور قاعدے کے ساتھ مطلب کا واضح طور سے ادا ہونا دلوں کو برانگیختہ کرنے لگا۔ یہاں تک کہ شعرا نے ادھر رغبت کی نگاہ سے دیکھا۔ اُس وقت ہم تین شاعر با مذاق نام بر آوردہ تھے: میں اور مومن خاں اور ذوق۔ ذوق نے ادھر کم رغبت کی کیونکہ ان کو اپنے مضمون ہی کے باندھنے میں دقت پڑتی تھی، زبان کی طرف کب خیال کر سکتے ہیں [؟ تھے]، مگر مومن خاں نے خیال کیا۔ پہلے یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ شاہ نصیر کی جو طرز ہے وُہ معلوم ہے، مگر مومن خاں نے ان کو چھوڑ کر ناسخ کی طرز پر غور کیا اور فارسی کی تراش خراش پر توجہ کی۔ ادھر میں نے بھی۔ غرض ہم دونوں دہلی کی طرز زبان کو چھوڑ کر ترکیب اور بندش کی درستی میں مصروف ہوئے۔ مگر جب بہت کچھ کہہ گئے تو دیکھا کہ ہم دونوں کی طرز الگ الگ ہو گئی اور نہ کوئی ناسخ سے نہ

ملی۔ میں نے تو میر تقی میر کا انداز اختیار کیا اور مومن خاں اپنے اسی رنگ میں رہے۔ خلاصہ یہ کہ دہلی کی زبان میں ہر شاعر کے کلام میں اختلاف پاؤ گے اور اختلاف کی وجہ یہی ہے کہ ناسخ نے جن قاعدوں سے زبان کو درست کیا، جس کے سبب سے تمام لکھنؤ کی ایک ہی زبان ہوگئی، وہ قاعدے عام نہیں ہوئے کہ ہم تک پہنچتے۔ ناچار اپنی جودت طبع سے جو کچھ ہُوا وہ کیا۔ مگر یاد رہے کہ مضمون دہلی کا اور زبان لکھنؤ کی مستند ہے۔ ایک تمہارے بحر صاحب فرماتے ہیں:

نہاتا ہے وُہ مہ دریا میں کپڑے حور دھوتی ہے

یہ معشوق کی تعریف نہیں ہوئی، بلکہ ایسا غریب معشوق ہے کہ کھڑے گھاٹ کپڑے دھلواتا ہے۔ اسی طرح شعرائے لکھنؤ کے اور چند شعر پڑھے۔ میں نے عرض کی حضور یہ سب سچ فرمایا مگر اتنا تو خیال کیا جائے کہ شاعر کو مضمون مل جانے اور باندھنے سے کام ہے، عشق و عاشقی ان کی بلا جانے۔ نہ یہ حقیقی عاشق اور نہ ان کا کوئی حقیقی معشوق۔ ان کے خیال کو خدا نے ایسی قوت عنایت فرمائی ہے کہ دوسروں کے حالات کو اپنے وہم کے زور سے ایسا باندھ دیتے ہیں کہ ہُو بہُو ہو جاتا ہے۔ ایک حقیقت میں اپنے شعر کی عرض کروں: میں چھپرہ میں ایک دوست کی ملاقات کو گیا، وہاں چند اشخاص اور بھی بیٹھے تھے۔ دو آدمی الگ کرسیوں پر تھے۔ مجھ سے لوگوں نے کہا کچھ شعر پڑھیے، میں نے چند شعر پڑھے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ شعر بھی پڑھا:

کس وقت سے ہم جام ہتھیلی پہ لیے ہیں
لو تھوڑی سی رنجش کو زیادہ نہیں کرتے

اس شعر پر وُہ دونوں شخص جو کرسیوں پر تھے، آپس میں کہنے لگے بھئی یہ تو رات کا بالکل واقعہ ہے۔ جناب پھر پڑھیے گا۔ میں نے پھر پڑھا۔ ان لوگوں نے

اس شعر کو لکھ لیا اور حقیقت یہ ہے کہ نہ میں شراب پیوں، اور نہ ایسا شرابی شخص میرے پاس تھا جس کے واسطے میں شراب جام میں بھر کر یہ کہتا، فقط وہم و خیال کا یہ کھیل ہے۔ حضور! مطلب اس تقریر سے یہ ہے کہ شاعر کے خیال میں جو کچھ آجائے اس کو باندھ دینا چاہیے۔ کیا غریب معشوق نہیں ہو سکتا؛ ہر ایک کا معشوق الگ ہوتا ہے۔ کسی کو گورا پسند ہے، کسی کو سانولا۔ "معشوق منست آنکہ بہ نزدیک تو زشت است" کا حال ہے۔ یہ سن کر حضرت غالب ہنسے اور فرمایا "بے شک ایسا ہی ہے، مگر میاں میں[1] نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے؛ وہ یہ ہے کہ فارسی میں رودگی (کذا) اور فردوسی سے لے کر خاقانی اور سنائی اور انوری وغیرہم تک ایک گروہ ہے۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے'

---

[1] یہاں سے "مگر مجھے کوئی ان کا شعر یاد نہیں" تک کی تمام عبارت "عود ہندی" میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں موجود ہے (مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۸-۲۱)۔ غالب کے خط کا متعلقہ حصہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ وہ عبارات و الفاظ جو صفیر کے بیان اور غالب کے خط میں مشترک ہیں، ان کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ صفیر نے غالب کے خط میں کس قدر ترمیم کی ہے۔

"اس رقعے میں ایک میزان عرض کرتا ہوں۔ حضرت صاحب ان صاحبوں کے کلام یعنی ہندیوں کے اشعار کو قتیل، واقف سے لے کر بیدل، ناصر علی تک اس میزان میں تولیں۔ میزان یہ ہے کہ رودکی و فردوسی سے لے کر خاقانی و انوری..... گروہ۔ ان حضرات..... متعدد نہیں۔ فغانی اور ایک شیوۂ خاص..... نازک و معانی بلند۔ اس شیوہ..... نظیری اور عرفی و..... نے بھی۔ سبحان اللہ..... سلاست کا چرچا دیا۔ صائب و کلیم اور قدسی و حکیم شفائی..... رودکی و فردوسی، یہ شیوہ..... سعدی کے طرز نے..... نظائر۔ خالصاً للہ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے۔ بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز ہی اور ہے۔ پس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز (جاری)

پھر حضرت سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی، یہ اشخاص متعددہ ہیں۔ فغانی ایک شیوۂ خاص کا مبدع ہوا، خیالہاے نازک اور معانیِ بلند کا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے، سبحان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا پرداز دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی اس زمرے میں ہیں۔ رودگی (کذا) و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کی تحریر نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔ تو اب طرزیں تین ٹھہریں: خاقانی اس کے اقران،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

چوتھی ہے۔ کیا کہنا ہے، خوب طرز ہے۔ اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہے، ہندی ہے۔ دار الضرب شاہی کا سکہ نہیں، ٹکسال باہر ہے۔ داد داد، انصاف انصاف۔ نظم۔ اگرچہ شاعران نغز گفتار ..... ناسخ کے کم تر ..... مجھے آپ کا کوئی شعر اس وقت یاد نہیں آیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صفیر نے "خالصاً للہ" سے "انصاف انصاف" تک کی عبارت حذف کر کے ایک دوسری عبارت درج کر دی ہے۔ غالب کا مذکورہ خط صفیر سے ملاقات سے پہلے کا ہے یعنی ۱۸۶۳ء (۸۰-۱۲۷۹ھ) کا۔ ممکن ہے غالب نے صفیر سے اس قسم کی گفتگو کی ہو اور صفیر نے "جلوۂ خضر" کی تصنیف کے وقت اس گفتگو کو حافظے سے قلم بند کرنے کی بجائے "عود ہندی" سے نقل کر دیا ہو۔

صفیر نے ایک جگہ اس خط کا حوالہ بھی دیا ہے:

"حضرت غالب نے عود ہندی میں ایک میزان درست کی ہے جس میں ان شعرا کے نتائج فکر کو دکھایا ہے ....." (جلوۂ خضر، جلد دوم، ص ۹۰)

یہاں غالب کے مذکورہ خط ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ظہوری اُس کے امثال، صائب اس کے نظائرہ۔ اب ان میں جس کی طبیعت کو حقانیت کی طرف میلان ہو گیا جس کو بظاہر عشق مجازی کا زینۂ آخر اور حقیقی کا زینۂ اوّل کہہ سکتے ہیں، ان کا کیا پُوچھنا، اور جو مجازی میں پُورے نکلے وہ بھی ان کے قدم بہ قدم ٹھہرے اور ان کے بعد کے درجے والے سب حقیقی میں ہیں:

اگرچہ شاعران نغز گفتار — زیک جام اند۔ در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضے حریفاں — خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

وہ "چیز دگر" حصے میں پارسیوں کے آئی ہے، ہاں اردو زبان میں اہل ہند نے وہ چیز پائی ہے، جیسے میر تقی میرؔ:

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

سودا:

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

قائم:

قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی کیوں کر مانوں
ہے تو ناداں، مگر اتنا بھی بد آموز نہیں

مومن خاں:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر، آتش کے ہاں بیشتر، یہ تیز نشتر ہیں، مگر مجھے کوئی

ان کا شعر اس وقت یاد نہیں"۔

میں نے التماس کیا کہ میں ان لوگوں کے شعر عرض کروں؛ فرمایا ہاں پڑھو۔

ناسخ: یہی کہتا ہے جلوہ میرے بُت کا
که اک ذاتِ خدا ہے اور میں ہُوں

جن کی رفتار کے مائل ہیں ہم — وہی آنکھوں میں پھرا کرتے ہیں
رکھو کسی طرح تو سروکار مہرباں — کرتے رہو جفا ہی، وفا گر نہ ہو سکے
مرچلا ہوں امیدواری میں — ایسی ہاں سے وہ کرنے کا شش نہیں

یہ شعر سن کر حضرت غالب نے فرمایا: "ہاں، ان میں بعض نشتر ہیں"۔

پھر میں نے آتش کے شعر پڑھے۔

آتش: آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اُٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

دمِ آخر بھی بالیں پر مرے ہم راہِ یار آئے
رقیبوں نے محل رکھا نہ باقی عذر خواہی کا

اُس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سوا شیشے سے نازک، دل سے نازک خوے دوست

سجدۂ شکر خدایا میں کیے رکھتا ہوں
قدمِ یار پہ ہے سر کو جھکانا شبِ وصل

یہ شعر سن کر فرمایا: "ان میں بھی بعض"۔

صفیر کے مذکورہ بیان کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں[1]:

"میر صفیر مرحوم کے بیان میں بعض باتیں محل نظر معلوم ہوتی ہیں؛

۱۔ میرزا کا دبیر کو بے مثال قرار دینا اور انیس کا ذکر تک نہ کرنا۔

۲۔ میرزا کی غذا، اس کے متعلق حالی اور صفیر کے بیان میں بہت فرق ہے۔

۳۔ فارسی شاعری کی مختلف طرزوں کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ لفظ بلفظ میرزا کے ایک خط سے ماخوذ ہے جو اردوئے معلی[2] میں موجود ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بجنسہ انھیں الفاظ میں خیالات کا اظہار دوبارہ کیا گیا، اور جو باتیں خط کی تحریر کے وقت یاد نہ آئی تھیں وہ تقریر کے وقت بھی فراموش رہیں۔ مثلاً ناسخ و آتش کے اشعار۔

۴۔ میر صفیر مرحوم ناسخ کے شاگرد کے شاگرد تھے، لیکن ناسخ سے جو عقیدت انھیں تھی وہ ان سے براہِ راست مستفید ہونے میں بھی کسی کو نہ ہوگی۔ جب وہ ناسخ کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو قصیدے کا انداز آجاتا ہے، اس لیے یہ بخوبی ممکن ہے کہ لاشعوری طور پر ناسخ کے متعلق کچھ ایسی باتیں ان کے قلم سے نکل گئی ہوں جو دراصل غالب کی بہ نسبت خود ان کے ذاتی خیالات سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں۔"

قاضی صاحب کا خیال درست ہے کہ صفیر کے بیان میں مندرجہ بالا امور محل نظر ہیں۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیس برس بعد جب وُہ غالب کی باتوں کو تحریر کرنے بیٹھے تو ممکن ہے کہ ان کے حافظے نے اصل واقعات میں کچھ "رنگ آمیزی" کر دی ہو۔

---

[1] مقالہ "میر صفیر بلگرامی اور میرزا غالب" مطبوعہ سہ ماہی "اردو"۔ جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۳۰۔

[2] جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، یہ خط عود ہندی میں بھی شامل ہے۔

صفیر نے "طبقات کرام سادات بلگرام" میں اپنے جو حالات لکھے ہیں، اُن میں بھی غالب سے ملاقات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

"... . مقام مارہرہ سے میں نے عریضۂ شاگردی حضرت غالب کی خدمت میں روانہ کیا جس کے جواب میں پہلے مثنوی ابرِ گہربار ہدیۃً اور بعد اس کے نوازش نامہ قبولیت استدعائے شاگردی آیا جو مرقع فیض وغیرہ میں چھپا ہے۔ میں نے ایک مثنوی شکریہ رسید مثنوی ابرِ گہربار میں موسوم بہ صبحِ امید فارسی مارہرہ میں کہہ کر تیسرے روز روانہ کی جس پر دو تین جگہ اصلاح ہو کر آئی اور وُہ چھاپ دی گئی ہے۔ بعد اس کے ایک مخمسہ غزل قدسی پر اردو کہہ کر وہیں سے بھیجا، اس پر ایک جگہ اصلاح ہُوئی.... مارہرہ سے ہو کر جب میں آرے میں آیا، یہاں سے بھی نامہ و پیغام حضرت غالب سے رہا۔ حضرت نے بوستانِ خیال کا ترجمہ مجھ سے ..... [ایک لفظ ناخوانا] تمام منگوا کر بھیجا (کذا)، جو کچھ چھپا تھا بھیج دیا اور جلدوں کے لیے تاکید لکھ آئی۔ آخر باشتیاق تمام ۱۲۸۲ھ میں مارہرے ہوتا ہوا حضرت غالب کی ملاقات کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ حضرت ناناصاحب نے تھوڑے[1] آم اپنے باغ کے ہدیۃً حضرت غالب کے لیے ساتھ کر دیے۔"

(ص ۱۷، ۴۱)

---

[1] "جلوۂ خضر" میں لکھا ہے کہ آم دو ہزار کی تعداد میں تھے۔ (جلد اول، ص ۲۲۲)

دیباچۂ رشحاتِ صفیر اور قطعۂ غالب

بقول صفیر، دہلی میں غالب سے ملاقات کے دوران صفیر نے اپنی کتاب "رشحاتِ صفیر" (رسالۂ تذکیر و تانیث) کا مسودہ انھیں دکھایا۔ غالب نے "دو چار روز میں تمام رسالہ دیکھ ڈالا" اور صفیر کو اس کی تقریظ لکھ کر دی[1]۔ صفیر کے بیان کا دُوسرا حصّہ محلِ نظر ہے۔ یہ تو درست ہو سکتا ہے کہ صفیر نے غالب کو رسالۂ تذکیر و تانیث کا مسودہ دکھایا ہو لیکن یہ درست نہیں کہ انھوں نے تقریظ بھی فوراً لکھ دی ہو۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کو صاحب عالم مارہروی کی خود نوشت بیاض سے ایک خط ملا تھا جو انھوں نے علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (ص ۹۷) میں چھپوادیا تھا۔ یہ خط ۲۶ راگست ۱۸۶۶ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں غالب لکھتے ہیں :

"دیباچے کا عظیم آباد کو روانہ ہونا معلوم ہوا مگر یہ نہ معلوم ہُوا کہ لختِ جگر و نورِ بصر مولوی سید فرزند احمد کو وہ دیباچہ پسند آیا یا نہیں۔"

اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے دیباچہ (یا بقول صفیر 'تقریظ') لکھ کر صفیر کو نہیں دیا تھا، بلکہ صاحبِ عالم کو بھیجا تھا اور انھوں نے صفیر کو بھیجا۔ اس سلسلے میں سید برکات حسن کا ایک خط بھی ملتا ہے جو "انشائے سبد گل" میں شامل ہے۔ اس میں برکات حسن لکھتے ہیں :

"..... اس سے پہلے میں نے تم کو تقریظ مرزا نوشہ غالب کی بھیجی، تم نے آج تک

---

[1] جلوۂ خضر، اوّل، ص ۲۲۴

اس کی رسید نہ لکھی اور نہ شکریہ اس کا مرزا صاحب کو تحریر کیا۔ آخر کو مرزا کا شکوہ آیا۔
برائے خدا اس منحوس عادت کو چھوڑو، خط کا جواب لکھا کرو۔" (ص ۳۰)

ظاہر ہے کہ اگر دیباچۂ غالب، صفیر خود دہلی سے لکھوا کر لائے ہوتے تو مذکورہ خطوط لکھنے کی نوبت نہ آتی۔

"محشرستانِ خیال" سے بھی یہ واضح ہے کہ غالب نے دیباچہ مارہرے بھیجا تھا۔ اس کتاب میں عالم خیال کی جو روداد پیش کی گئی ہے، اُس میں ایک جگہ غالب کی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے ہیں " ۱۲۸۲ھ میں جب آپ دہلی آئے تھے ایک کتاب الفاظ مونث و مذکر کی تحقیق میں آپ نے لکھی تھی اور میں نے اُس کو دیکھ کر اُس کی تقریظ بھی لکھ کر آپ کے نانا اپنے پیر و مرشد حضرت سید صاحب عالم مارہروی کے پاس مارہرے بھیج دی تھی۔" (ص ۲۶)

"رشحاتِ صفیر" کا دیباچہ "عود ہندی" میں پہلے چھپا اور "رشحاتِ صفیر" میں بعد میں۔ دونوں جگہ اس دیباچے میں بعض لفظی اختلافات ہیں۔ ذیل میں یہ دیباچہ "رشحات" سے نقل کیا جاتا ہے (طبع اول، آرہ ۱۲۸۹ھ) حواشی میں "عود ہندی" (مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء ص ۵۳-۴۵۲) کے اختلافات درج کیے گئے ہیں:

تقریظ رسالہ رشحات یعنی کتاب تانیث و تذکیر حصہ ہفتم مجموعہ فیض صفیر، بقلم خاص حضرت غالب دہلوی علیہ الرحمۃ۔

"سیدی سندی، نور بصر، لختِ جگر[۱]، قرۃ العین اسد، مولوی سید فرزند احمد کے طول عمر و دوام دولت و بقائے اقبال کی دعا مانگتا ہوں جن کو مبدءِ فیاض سے اس رسالے کے لکھنے کی توفیق عطا ہوئی ہے۔ سبحان اللہ[۲] تفرقۂ تذکیر و تانیث کی تقریر کردہ اور مطالب کی توضیح پر بھی مشتمل ہے، کس لطف سے ادا ہوئی[۳] ہے، ہرچند اس راہ سے کہ سید صاحب دانا اور دقیقہ رس اور منصف ہیں، قواعد تذکیر و تانیث کے منضبط

۱؎ عود: "نور بصر و لخت جگر
۲؎ عود: "سبحان اللہ تذکیر و تانیث کی تقریر......"
۳؎ عود: "...... ہوئی، ہرچند......"

نہ ہونے کے خود معترف ہیں۔ لیکن قوت[51] علم اور حسن فہم اور لطف طبع سے وہ مضبوط ضوابط بہم[52] پہنچائے ہیں، مجھے دل سے پسند آئے ہیں۔ دُعا یہ ہے اور یقین بھی یہی ہے کہ یہ رسالہ[53] صفحۂ دہر پر یادگار اور ہمیشہ منظور انظار[54] اولوالابصار رہے گا۔ جو صاحب اس کو مطالعہ فرمائیں گے، نفع بھی پائیں گے اور لطف بھی اٹھائیں گے۔ مولف صاحب جو کامیاب اپنے ذہن رسا سے ہیں، رئیس جلیل القدر[55] آرہ اور حضرت فلک رفعت مولوی صاحب عالم صاحب مارہروی کے نواسے ہیں، سید واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات علم و فضل میں نامی اور قدر و منزلت میں گرامی ہیں۔ ان حضرت[56] کا مادح گویا اپنا ثنا خواں ہے۔ جیسا کہ مولوی معنوی رومی علیہ[57] الرحمۃ کا بیان ہے

مادحِ خورشید مدّاحِ خود است کہ مرا دو چشم سر نامرمد است

داد کا طالب غالب - ۱۲ [مُہر غالب: محمد اسد اللہ خان ۱۲۴۸ ہجری]

رشحات کی طبع اوّل میں حضرت صاحبِ عالم مارہروی کی تقریظ بھی شامل ہے۔ اس تقریظ میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں ہے:

"ملک الشعرائے ہندوستان، استاد ہمہ دان دقائق فارسی و ہندی زبان، نواب محمد اسد اللہ خاں صاحب غالب تخلص نے تقریظ اس پر قلمی فرمائی، قدر و منزلتِ مولف و تالیف بڑھائی۔ بعد تحریر خدمت موصوف کی حاجت و ضرورت دُوسری تحریر کی کب ہے۔"

غالب و صفیر کے تعلقات کی داستان بظاہر یہاں ختم ہوجاتی ہے، لیکن بالواسطہ تعلق ابھی قائم رہتا ہے۔ ۱۲۸۳ھ میں صفیر کے ہاں لڑکا پیدا ہوا[58] جو دوسری

---

[51] عود: قوت علم و حسن فہم و لطف طبع۔

[52] عود: "..... بہم پہنچائے ہیں کہ اور صاحبوں کے دل کی دوسرے کو کیا خبر مگر مجھے تو دل سے....."

[53] عود: "کہ رسالہ....."

[54] عود: نظر [باقی حواشی اگلے صفحے پر]

عبدالغفور سرور نے نو قطعاتِ تاریخ لکھے اور غالب کو اصلاح کے لیے بھیجے۔ غالب نے نہ صرف یہ کہ ان کی اصلاح کی بلکہ "دوسرا قطعہ انھیں پسند نہ آیا اور 'سراسر تکلفات باردہ' لکھ کر انھوں نے پورا قطعہ قلم زد کر دیا۔ لیکن اپنے دوست اور شاگرد کا دل رکھنے کے لیے ایک اردو قطعہ جیب خاص سے مرحمت بھی کر دیا[۵]"۔ غالب کا 'عطا کردہ قطعہ یہ ہے:

پور وہ فرزند احمد کو ملا رحمتِ باری کا جو گنجینہ ہے
سالِ تاریخ ولادت یوں لکھا راحتِ جاں ہے سرورِ سینہ ہے[۶][۷]

قطعات کی اصلاح کے ساتھ غالب نے سرور کے نام ایک خط بھی لکھا۔ یہ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۶ء کا مکتوبہ ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں "۔ . . . آرہ میں مولوی سید فرزند احمد کے مکان کا پتا لکھ بھیجو تاکہ میں ان کو تہنیت لکھ بھیجوں"۔ اس سے ڈاکٹر مختارالدین احمد نے یہ نتیجہ نکالا ہے:

"۔ . . . ستمبر [دسمبر؟] ۱۸۶۶ء سے صفیر و غالب کی باقاعدہ خط و کتابت کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس سے پہلے ممکن ہے حضرت صاحب عالم یا سرور کے خطوں میں وہ دعا و سلام بھیج دیتے ہوں یا مارہرہ ایک آدھا خط انھوں نے لکھا ہو، لیکن اس وقت انھیں آرہ میں صفیر کے مکان کا پتا معلوم نہ تھا[۸]"۔

یہ بیان محل نظر ہے۔ غالب و صفیر کی خط و کتابت ۱۲۸۰ھ سے شروع ہوئی تھی اور غالب کا آخری خط، ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ[۹] کا ملتا ہے۔ رہی یہ بات کہ غالب نے صفیر کا پتا

ص ۱۱۳ کے حواشی

[۵] عود: . . . . جلیل القدر عظیم آباد و آرا اور . . . .۔

[۶] عود: حزات [۷] عود میں شعر کے بعد کی عبارت نہیں ہے۔

[۸] صفیر کے فرزند کا نام سید نور احمد تھا۔ (پیدائش ۹ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۶۶ء۔ وفات ۲۰ محرم ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۰ جون ۱۸۹۸ء)۔ سید وصی احمد بلگرامی انھی سید نور احمد کے فرزند ہیں۔ [اس صفحے کے حواشی اگلے صفحے پر]

دریافت کیا تھا تو ممکن ہے کہ سرور کو خط لکھتے وقت انھیں صفیر کا پتا یاد نہ رہا ہو ورنہ آرسے کے پتے پر ان کی صفیر سے خط وکتابت رہ چکی تھی۔ مکتوب غالب بنام سرور کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی صفیر سے دوبارہ مراسلت ۱۸۶۶ء میں شروع ہوئی ہوگی۔ لیکن ابھی تک غالب کا کوئی ایسا خط (بنام صفیر) دستیاب نہیں ہوا جو ۱۲۸۱ھ کے بعد کا ہو۔

یہاں تک صفیر و غالب کے تعلقات کی داستان بیان کی گئی ہے۔ صفیر کی تصانیف میں ایسی متعدد تحریریں ملتی ہیں جن سے غالب کے حالات پر روشنی پڑتی ہے یا غالب کی شاعری کے بارے میں صفیر کی رائے معلوم ہوتی ہے۔ آیندہ اوراق میں ان تحریروں کو پیش کیا جائے گا۔

ص ۱۱۴ کے حواشی

[1] مقالہ "غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں" از ڈاکٹر مختار الدین احمد ماہنامہ "آج کل" بابت فروری ۱۹۵۵ء، ص ۴۔

[2] اس مصرعے کے اعداد ۱۲۸۴ ہیں جبکہ سرور کے تمام قطعات سے ۱۲۸۳ھ برآمد ہوتا ہے۔

[3] مقالہ از ڈاکٹر مختار الدین احمد، محولہ بالا، ص ۳

[4] مطابق ۳ مئی ۱۸۶۵ء۔

انشائے سبدِ گل

اس مقالے کے دوسرے باب میں "انشائے سبدِ گل" کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ اور اس کے حوالے سے غالب کے خطوط بنام صفیر پیش کیے جا چکے ہیں۔ اس کتاب میں شامل بعض خطوں میں غالب کا ذکر ملتا ہے جس سے غالب کے آخری زمانے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ "انشائے سبدِ گل" میں غالب کا ایک خط بنام میر ولایت علی بھی شامل ہے۔ ذیل میں اس کتاب سے ضروری اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

سید صاحب عالم مارہروی اپنے ایک خط میں صفیر کو لکھتے ہیں:

"حال واضمحلال مرزا نوشہ صاحب کمال ملال داد۔ او تعالیٰ در عمر وصحت شان بیفزاید۔ شنیدہ ام کہ از گران سمعی دوات وقلم نزد شان می باشد، مردمان کہ برائے ملاقات می روند، حالات خود را تحریر کردہ می دہند۔ جواب زبانی یا قلمی می یابند۔ برخورداران مقبول عالم وسید آل محمد وسید برکات حسن رفتہ دیدہ آمدہ اند۔ یاد شما بسیار می کردند وشکایت عدم نویسی خط می نمودند، لازم کہ معذرت نامہ بخدمت شان فرستہ۔" (ص ٦)

صفیر نے اس کے جواب میں لکھا:

"احوال جناب غالب مدظلہ از اعتذار[1] شان کہ طبع شدہ، مشتہر گردیدہ معلوم شد وتحسر بر تحسر افزود کہ حالا زمانۂ شان آخر است، خداوند تعالیٰ از قدرت کاملۂ خود دریں پیرانہ سری قوتے بخشد کہ از باقی ماندگان ہند ومغتنمات زمانہ ہستند۔ عریضہ بخدمت شان روانہ کردہ ام تا جواب چہ آید۔" (ص ٧)

صفیر نے غالب کے نام جو خط لکھا ہوگا، اس کا جواب شاید نہیں آیا،

---

[1] یہ اُس بیان کی طرف اشارہ ہے جو غالب نے فروری ١٨٦٧ء میں دہلی کے دو اخباروں (اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار) میں چھپوایا تھا اور جس میں بیماری کی وجہ سے خطوں کے جواب نہ دینے پر معذرت کی گئی ہے۔ (ذکر غالب، مالک رام، ص ٦٥-١٦٤)

ورنہ صفیر اسے بھی شایع کر دیتے۔

سیّد مقبول عالم، غالب سے اپنی ملاقات کا حال صفیر کے نام ایک خط میں ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"..... نیمۂ شوال خیر مآل گزشتہ، راقم آثم رامعہ برادر صاحبان سید آل محمد صاحب وسید برکات حسن صاحب بہ پیش آمد تقریب سفر میرٹھ از مارہرہ حرکت داد۔ غلطم، ما یان کجا و چرا می رفتیم۔ علت غائی استحصال ملازمت جناب غالب بود، ورائے ما سہ برادر عزیزی مظہر علی نبیرۂ بالا میان صاحب مرحوم از کمال اشتیاق مرزا صاحب ترک روزگار کردہ، با ما ہمپا شد، القصہ:

برفتیم قاصد بدیدار مرد

مگر افسوس جز این کہ جسم باجان وچشم نگران و زبان جنبان یافتیم ازو..[1] مرزا صاحب چہ خبر دہم۔ سامعہ مفقود، حافظہ نابود، قوای حساسہ معطل، دماغ مختل، پرچۂ اعتذاری بانطباع دادہ اند، عنوان آن باین شعر نہادہ اند:

دیگر از خویشتم خبر نبود تکلف بر طرف

این قدر دانم کہ غالب نام یارے داشتم

ملالتے کہ از دیدن میر امامی عموں صاحب و قبلہ مغفور بر داشتہ بودم ہمان و ہمچنان از ملاقات مرزا صاحب حاصل و کمال تاسف بدل وجان واصل شد۔ بخدمت نانا صاحب شما بیتے نوشتہ فرستادہ اند کہ ہرگاہ داعی اجل را لبیک گویم این بیت را بند قرار دادہ ترجیع بند فرمایند۔ این ست:

رشک عرفی و فخر طالب مُرد

اسد اللہ خان غالب مُرد

---

[1] ایک لفظ کتاب کے کِرم خوردہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں۔

چہار روز اتفاق قیام دہلی افتاد ، ہر روزہ بخدمت مرزا صاحب حاضر می شدم و از اشفاق و اخلاق چہ شرح رود، با این ہمہ ناتوانی و نیم جانی چندان مبذول می فرمودند کہ خاطر ترک مجالست را نمی خواست و پا بر نمی خاست ۔ وقت رخصت بجانبین کلال و ملال دست داد ۔ لطائف و ظرائف این حالت نیز شنیدنی است ، ان شاء اللہ تعالیٰ از زبان برادرم سید آل محمد صاحب اصغا خواہد شد ۔ آن عزیز را ہر چہ از نتائج افکار گہر بار درین عرصہ بعد از آمدن جہان خان فراہم شدہ باشد، بہمراہی برادرم حاجی عبداللہ صاحب لطف کردنی است ۔" (ص ۸ - ۷)

صفیر اس کے جواب میں لکھتے ہیں :

".... سیر دہلی و ملاقات حضرت غالب مدظلہ حسرتے بمن داد ۔ کاش من ہم سایہ آسا ہمراہ می بودم و درین وقت ہم زیارت حضرت غالب می کردم ۔ حیف استادے کہ از باقی ماندگان ہند بود مرحلۂ آخر می پیماید ۔ خداوند تعالیٰ بر نیم جانیش ببخشاید ... [1] کہ دم غنیمت است ۔" (ص ۸)

"انشائے سبد گل" میں صفیر نے اپنی اور غالب کی مراسلت کے درمیان غالب کے دو خط بنام میر ولایت علی درج کیے ہیں ۔ میر موصوف مطبع عظیم المطابع کے مالک تھے ، جہاں سے صفیر کا ترجمۂ بوستان خیال چھپا تھا ۔ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے پہلے خط کے ابتدائی حصے کے بعض الفاظ پڑھنے میں نہیں آتے ۔ ایسی جگہوں پر نقطے لگا دیے ہیں ۔ ایک جگہ کتاب ہی میں نقطے لگے ہیں ، یہاں "کذا" لکھ دیا گیا ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود صفیر نے اس خط کے بعض الفاظ حذف کر دیے تھے ۔ اس خط پر یہ عنوان درج ہے :" خط حضرت غالب بنام میر ولایت علی مہتمم مطبع بھی لطف سے خالی نہیں ۔" یہ خط پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آ رہا ہے :

---

[1] چند الفاظ کتاب کے کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہیں ۔

غالب کا ایک نایاب خط (۷)

"... شفیق مکرم میر ولایت علی صاحب کو خدائے جہان آفرین ... سلامت رکھے۔ از روئے اودھ اخبار لکھنؤ بوستانِ خیال کا ترجمہ مسمی بہ پرستان خیال آپ کے مطبع میں آمادۂ انطباع بلکہ دو جلدوں کا منطبع ہو جانا اور دونوں نسخوں کا بہ قیمت عہ۱۲ کے بشرط ارسال محصول ڈاک ہاتھ آنا معلوم۔ ۲ ٹکٹ .... بابت دو روپیہ کے بھیجتا ہوں۔ پونے دو روپے قیمت کے اور چار آنے از روئے قیاس محصول کے .... (کذا) فقیر کو آج یہ حال معلوم ہوا، آج ہی خط معہ محصول روانہ کیا۔ آپ سے مستدعی بلکہ متقاضی ہوں کہ اسی طرح آپ بھی عجلت کو کام فرمایئے اور جس دن میرا خط پہنچے، اُس کے دُوسرے دن پارسل روانہ کیجیے۔ صورت تعجیل میں شکر گزار اور صورتِ توقف میں گلہ سنج رہوں گا۔ ۸ ذیقعدہ"

[مُہر : محمد اسد اللہ خاں، ۱۲۳۸] (ص ۱۵-۱۴)

یہ خط ۸ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ کا ہے۔ اسی روز غالب نے صفیر کے نام بھی ایک خط لکھا تھا، جو صفیر کے نام خطوط میں درج کیا جا چکا ہے۔ غالب، میر ولایت علی کے نام کے لفافے میں ٹکٹ رکھنے بھول گئے تھے، لہٰذا دوسرے ہی روز انھوں نے ایک اور خط لکھا۔ "انشائے سبد گل" میں اس کا عنوان یہ ہے: "پرچۂ ثانی حضرت غالب بنام میر صاحب موصوف مشعر اعتذار۔"

مکتوب غالب (۸)

"جناب میر ولایت علی صاحب! واسطے اپنے جد کے میری تقصیر معاف کیجیے، اور حقیقت میں میرا گناہ نہیں:

پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

ستر برس کی عمر، حافظہ معدوم، نسیان مستولی۔ کل آپ کو خط لکھا،

لفافہ کرتے وقت ٹکٹ لپیٹنے بھول گیا آج جو بکس کھولا تو ٹکٹ بکس میں پائے، ذلیل و خوار و خجل و شرمسار، آج لفافۂ جدید میں ملفوف کر کے بھیجتا ہوں۔ خدا کرے پہنچ جائیں ۹ ذیقعدہ، غالب یک رنگ۔" (ص ۱۵)

یہ خط اس سے پہلے "رشحاتِ صفیر" (طبع دوم، ص ۵۰-۵۴) میں چھپ چکا ہے۔ اسے وہاں "ٹکٹ" کی تانیث کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔ رشحات میں اس خط کا متن مذکورہ متن سے قدرے مختلف ہے۔ ذیل میں رشحات کے متن کے اختلافی الفاظ درج کیے جاتے ہیں۔ مشترک الفاظ کی جگہ نقطے لگا دیے گئے ہیں:

خط حضرت غالب علیہ الرحمۃ بنام میر ولایت علی بہ طلب بوستان خیال صفیر بلگرامی

"..... صاحب مہتمم مطبع عظیم المطابع عظیم آباد، واسطے ..... کیجیے۔ درحقیقت میرا گناہ نہیں..... حافظ معلوم (کذا) ..... کل آپ کو بہ طلب ترجمۂ بوستان خیال مترجمہ صفیر بلگرامی خط لکھا..... بکس کھولا۔ ٹکٹ بکس ..... خدا کرے کتاب وہاں سے پہلے روانہ ہو اور یہ لفافہ وہاں بعد پہنچے۔ ۱۲۔ نجات کا طالب، غالب۔ ۱۶[1] اپریل ۱۸۶۵ء۔"

قاضی عبدالودود نے یہ خط "آثارِ غالب" (علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، ص ۶) میں شامل کیا ہے۔ اس کے بارے میں قاضی صاحب لکھتے ہیں:

"میر ولایت علی کے نام کا خط "فیضِ صفیر" (رشحاتِ صفیر) کی اشاعت ثانی سے ماخوذ ہے۔ غالباً اشاعت اوّل میں یہ خط نہ تھا۔ اور "فیضِ صفیر" کا جو خلاصہ حال میں چھپا ہے، اس میں بھی یہ خط شامل نہیں۔ صفیر بلگرامی نے اس خط کو اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا ہے کہ ٹکٹ مونث بھی ہے، لیکن مجھے جناب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی اس رائے سے کامل اتفاق ہے کہ اس سے ٹکٹ کی تانیث ثابت نہیں ہوتی۔ (خط بنام راقم) میر ولایت علی کے متعلق تحقیقات سے کوئی نئی بات معلوم نہ ہوئی

[1] صحیح: ۶۔ اپریل ۱۸۶۵ء (مطابق: ۹۔ ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ)

اور نہ اس خط کا پتا چلا[1] جو اس سے پہلے غالب نے میر ولایت علی کو لکھا تھا۔ اس خط کا لفافہ البتہ [کتب خانۂ مشرقی بانکی پور] میں محفوظ ہے۔ اس پر یہ عبارت مندرج ہے:

"در عظیم آباد پٹنہ، بہ محلہ کشمیری کوٹھی مطبع عظیم المطابع موصول و بہ خدمت جناب میر ولایت علی صاحب مہتمم مطبع مذکور زاد مجدہٗ مقبول باد۔ بیڈ، ضروری، جواب طلب" لفافے پر مُہر بھی ہے جس کا نقش "غالب ۲، ۱۲" ہے۔ اس لفافے کا عکس ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے اُس مقالے کے ساتھ شائع کیا ہے جس کا عنوان "غالب کے لفافے" ہے اور جو اپریل ۱۹۳۴ء کے 'ہندستانی' میں چھپا تھا۔ صفیر بلگرامی جلوۂ خضر جلد ۱ (ص ۲۲۲) میں لکھتے ہیں کہ "جب میں نے 'بوستانِ خیال' کو اردو کر کے اس کی ایک جلد مطبع عظیم المطابع پٹنہ میں چھپوائی اور اس کا اشتہار بذریعہ 'اودھ اخبار' مشتہر ہوا، حضرت غالب نے ایک خط مع اس کی قیمت کے میرے پاس پٹنہ بھیجا، میں نے ایک جلد بھیج دی۔" یہ اسی[2] خط کی طرف اشارہ ہے، گو مکتوب الیہ میر ولایت علی ہیں۔ بوستان خیال مترجمہ صفیر کی ایک جلد میں نے لڑکپن میں دیکھی تھی، اس وقت باوجود تلاش نہ مل سکی۔ غالباً اور جلدیں نہیں چھپیں، بلکہ یہ بھی یقین نہیں کہ صفیر نے اور جلدیں بھی ترجمہ کی تھیں[3]۔ (ص ۴۴)

"انشائے سید گل" میں ایک اور جگہ غالب کا ذکر ملتا ہے۔ سید آل محمد مارہروی کے خط کے جواب میں صفیر ایک فارسی غزل بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں:

---

[1] یہ خط اوپر درج کیا جا چکا ہے۔

[2] اس سلسلے میں غالب نے صفیر کو بھی ایک خط لکھا تھا جو اس مقالے میں درج کیا جا چکا ہے۔ صفیر نے اپنے نام کے اسی خط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[3] اس سلسلے میں زیرِ نظر مقالے کا پہلا باب ملاحظہ ہو جس میں اس کتاب کے بارے میں تفصیلات فراہم کی گئی ہیں۔

"حضرت غالب مدظلہ رام پور تشریف لے گئے تھے۔ خدا جانے آئے یا نہیں۔ اگر آنے کی خبر ہو تو نانا صاحب کے خط کے ساتھ یہ غزل اصلاح کے لیے بھیج دینا۔" (ص ۴۲)

اس خط پر تاریخ نہیں ہے، لیکن غالب کے دوسرے سفرِ رام پور کی تاریخوں[۱] کے پیشِ نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط، ۸ اکتوبر ۱۸۶۵ء اور ۸ جنوری ۱۸۶۶ء (مطابق ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ) درمیانی عرصے میں یا اس کے کچھ دنوں بعد لکھا گیا ہوگا۔

---

[۱] ذکرِ غالب، مالک رام، طبع چہارم، دہلی، ۱۹۶۴ء۔ ص ۵۷-۱۵۳

جلوۂ خضر

صاحبِ عالم مارہروی کا حال لکھتے ہُوئے جلوۂ خضر، جلد اول میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے:

"حضرت غالب علیہ الرحمۃ کو ان کے ساتھ ارادتِ خاص تھی۔ 'پنج آہنگ'[1] اور 'اردوے معلّٰی' اور 'عود ہندی' میں ان کے نام کے مکتوب اور رقعات بہت ہیں۔ شعر و سخن کی بحث غالب سے اکثر رہا کرتی تھی۔ انھیں کی تحریک سے مؤلف ۱۲۸۳ھ میں حضرت غالب کے پاس دہلی گیا اور شاگرد ہو آیا۔" (ص ۲۰۰)

جلد اوّل کے آخر میں اساتذۂ دہلی کے کلام سے محاوراتِ دہلی درج کیے ہیں اس ضمن میں "معذرت" کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"... میں غالب علیہ الرحمۃ کا شاگرد ہُوں مگر چُوں کہ وُہ بھی دہلی کی زبان باندھتے تھے اس لیے ان کے کلام میں بھی جو خلاف محاورۂ لکھنؤ ہیں، لکھے جاتے ہیں.... اگرچہ حضرت غالب نے اکبر آباد کے مطبع اموں جان (کذا) میں اپنے دیوان کے خاتمے پر ایک معذرت[2] چھپوا بھی دی ہے کہ 'میرے کلام میں جو الفاظ اور محاورے ناقص بندھ گئے ہیں میں کیا کروں، دہلی کی زبان ہی ایسی ہے، میں بھی ان کو ناپسند کرتا ہُوں'۔" (ص ۲۸۹)

اس کے بعد "محاوراتِ دہلی" سے متعلق سات اشعار میں پھر صفیر لکھتے ہیں:

---

[1] پنج آہنگ میں صاحب عالم کے نام کا کوئی خط شامل نہیں۔

[2] یہ حاشیہ ص ۱۲۶ پر ملاحظہ ہو

"واضح ہو کہ حضرت غالب کے کلام میں ایک تو محاوراتِ دہلی بہ سبب بندش و ترکیب فارسی کے بہت کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو وہ خود ان کو ناپسند کرتے تھے۔ چنانچہ اکبرآباد کے مطبع اموجان میں جو ان کا دیوان چھپا ہے، اس کے خاتمے میں اس کی معذرت انھوں نے چھپوادی ہے۔ (ص ۲۹۰)

ناسخ کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے جلوۂ خضر، جلد دوم میں صفیر لکھتے ہیں:

"میرے برادر گرامی قدر حضرت سید برکات حسن[1] صاحب بن حضرت سید محمد امیر صاحب سجادہ نشین مارہرہ جب غالب علیہ الرحمۃ کی ملاقات کو دہلی گئے اور حضرت نے کچھ اپنا کلام سنایا، اس مقطع کو بھی پڑھا:

ضعف نے غالب نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

حضرت برکات حسن نے کہا کہ دیوان میں تو "عشق نے غالب نکمّا کر دیا" لکھا ہے۔ فرمایا یہ عشق کا لفظ اُسی زمانے کے واسطے تھا، اب اس لفظ سے شرم آتی ہے۔[2] (ص ۶۰)

غالب کی نثر کے بارے میں صفیر لکھتے ہیں:

---

[1] حاشیۂ صفیر: یہ مولف کے بہنوئی ہیں اور مولف کے جدِ امجد کے بھانجے۔ ان کے بزرگ سیکڑوں برس سے سجادہ نشین قصبہ مارہرہ ضلع ایٹہ ہوتے آئے ہیں۔ ان کے برادرِ بزرگ حضرت سید محمد حسن صاحب اپنے والد کے مقام پر سجادہ نشین ہیں . . . .

[2] شیخ ریاض الدین احمد نے "سیرِ دہلی" میں لکھا ہے کہ انھوں نے مذکورہ شعر غالب کے سامنے پڑھا تو انھوں نے فرمایا: "اے بھئی چُپ رہو یوں کہو کہ:

ضعف نے غالب نکمّا کر دیا
یا: دہر نے غالب نکمّا کر دیا

عشق کیا، عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔" (ص ۳۴)

"تاثیر در نثر کے موجد اردو میں اول استاد نا حضرت غالب علیہ الرحمۃ گنے جاتے ہیں کہ انھوں نے بعد ترکِ تحریرِ فارسی اُردو میں خط لکھنے کی وضع ایسی نکالی کہ گویا مکتوب الیہ سے باتیں کرتے ہیں۔" (دوم، ص ۱۰۲)

صفیر نے اپنے حالات میں سید بندہ رضا بلگرامی کا ایک خط درج کیا ہے، جس کی مندرجہ ذیل عبارتیں غالب سے متعلق ہیں:

"آپ کو اور جناب قدر[1] کو مرزا غالب کی محبت نے ایسا مجبور کر رکھا ہے جیسا قوم نصیری کو حُبِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے۔ حالانکہ میرا بھی اعتقاد ہے کہ مرزا غالب صاحب فارسی میں اکثر اہلِ ہند سے بہتر ہیں مگر اُردو میں تو ایک مبتدی لکھنؤ کے مقابل بھی نہیں۔

کاو کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پُوچھ

قابلِ ملاحظہ اور انصاف طلب ہے .... مجھ کو یہ بھی آپ کی اور جناب قدر کی طرف سے اب احتمال ہے، عجب نہیں کہ مرزا صاحب مرحوم تاریخ بلگرام میں بھی کسی نہ کسی پیرائے سے داخل کر دیے جائیں۔ میری اس رائے ناقص سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ مرزا غالب صاحب کا غیر معتقد ہوں، مگر بمقابلہ لکھنؤ کے دلّی والوں کو میں ضرور ناقص سمجھتا ہوں..

..... " (دوم ص ۹۰ - ۱۸۹)

صفیر نے اس خط کا جو جواب لکھا تھا وہ بھی دستیاب ہو چکا ہے۔ یہ خط سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے رسالہ "آج کل" دہلی بابت فروری ۱۹۵۵ء میں چھپوا دیا ہے[2]۔ صفیر کے خط کا وہ حصہ جو غالب سے متعلق ہے، ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ بندہ رضا بلگرامی کا خط ۱۸ مئی ۱۸۸۳ء کا تھا، صفیر کا جواب، جون ۱۸۸۳ء کا ہے:

"میری تحریر جو اساتذہ کے باب میں ہے یا ایسی ایسی باتوں میں جو میری رائے ہے،

---

[1] قدر بلگرامی جو صفیر کے قریبی عزیز اور غالب کے شاگرد تھے۔

[2] مقالہ: "۱۸۸۳ء کے دو خطوط متعلق بہ غالب"

نہ ابھی آپ نے دیکھی نہ سُنی۔ میں اپنے ہوش کے وقت سے کبھی ایسے کا شاگرد نہیں ہوا جس کو سمجھ نہ لیا ہو۔ محبّت اور چیز ہے اور سمجھ اور چیز ہے۔ سنیئے! میں نے جو غالب کو سمجھا ہے، حقاً اور ایماناً بیان کرتا ہوں۔ علم عربی میں تو ان کو محض ناآشنا جانتا ہوں مگر بزور فارسی ان میں ضروری واقفیت کا قائل ہوں۔ فارسی میں ان سے بڑھ کر کسی شاعر ہند کو فارسی گو نہیں سمجھتا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ سنیئے، ہندوستان میں یہی نامی شاعر ہوئے ہیں: ۱۔خسرو ۲۔بیدل ۳۔آرزو ۴۔قتیل ۵۔مظہر جان جاناں ۶۔فقیر ۷۔حسن اور ۸۔غالب ان کے سوا غنی کشمیری تھے، واقف لاہوری تھے، علی سرہندی تھے اور فیضی ..... شاعر خاص ہندوستانی تھے۔ ان میں سے خسرو، فقیر، حسن ایک پائے کے اور آرزو قتیل ایک سرمائے کے اور بیدل، مظہر، غالب ایک پائے کے ہیں۔ مگر خسرو اور حسن دہلوی اس وضع کے شاعر تھے جو وضع سعدی کے پہلے تھی جس کو ابوالفضل نے متروک اور ناپسند لکھا ہے۔ وہ لوگ عرفان مآب تھے، شاعر نہ تھے۔ بلند نام اور عالی مقام تھے، شاعر نہ تھے۔

آرزو، قتیل، نہ اِلّا الذی نہ اُلّا الذی .... مگر ان کی معلومات کا قائل ہوں، نہ ان کے مذاق شاعری کا۔ بیدل، مظہر، غالب یہ

ص ۱۲۳ کا حاشیہ

[۵] مطبع احمدی، شاہدرہ، دہلی کے مہتمم کا نام اموجان تھا۔ غالب کے دیوان کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء میں مطبع احمدی سے طبع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں اموجان کا نام بطور مہتمم مطبع درج ہے۔ صفیر کے پیش نظر یہی ایڈیشن ہوگا۔ اس کے آخر میں "عبارت خاتمۂ دیوان" کے عنوان کے تحت غالب نے دوران طباعت غلطیاں درست کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی لکھا ہے کہ لفظ "کسو" (بجائے "کسی") صحیح لیکن غیر فصیح ہے۔ صفیر نے غالب کی طرف سے معذرت کے جو الفاظ لکھے ہیں وہ "عبارت خاتمہ دیوان" میں نہیں ہیں۔ (تفصیل کے لیے رک: دیوان غالب، نسخۂ عرشی، دیباچہ، ص ۱۰۲)

تینوں بہادران میدان سخن* تھے۔ بیدل اور مظہر نے مضامین عارفانہ کو مذاق شاعرانہ سے ملاکر جیسا کہا ہے، دل لوٹا جاتا ہے......۔

غالب جنت آرام گاہ کہ خاتم الشعرائے فرس ہندوستان میں ہوئے ہیں، ان کی درخشانیِ طبع نے آخرِ زمانہ میں ہندوستان کا نام روشن کردیا۔ کلام فارسی ان کا مشہور اور زبانوں پر مذکور ہے۔ چند شعر مثالاً لکھے جاتے ہیں:

اے ز ساز زنجیرم در جنوں نواگر کن
بند گر بدیں ذوق است پارۂ گراں تر کن

جنوں مستم بہ فصل نوبہارم می تواں کشتن
صراحی بر کف و گل در کنارم می تواں کشتن
بہ جرم ایں کہ در مستی بپایاں بردہ ام عمرے
بہ کوئے مے فروشاں در خمارم می تواں کشتن
بہ ہجراں زیستن کفر است، خونم را دیت نبود
چراغِ صبح گاہم آشکارم می تواں کشتن

حشر است و خدا داور و ہنگامہ بپایاں
اے شکوۂ بے مہریِ احباب کجائی

خود را ہمی بہ نقش طرازی علم کنم
تا با تو خوش نشینم و نظارہ ہم کنم

یہ حقیقت شعرائے فارسی گوئے ہندوستان کی تھی۔ اب ان لوگوں میں سے سب نے

اردو شعر کہے ہیں۔ مگر وہ ابتدا تھی۔ تفریحاً اور تفنناً کہنے کا اتفاق ہوا اور غالب کہ آخر میں ہوئے، انھوں نے زمرۂ شعرائے اردو میں گنجایش کی اور اردو شاعری بہ طرزِ خاص کی، اور طرز خاص کی وجہ وہی ہوئی جو ناسخ کا کلام دیکھ کر اہل دہلی کے لیے واقع ہوئی۔ مگر سب میں غالب نے جو طرز بیان ایجاد کی بہ نسبت اوروں کے سہل اور صاف ہے۔ اور اس کی دو صورتیں ہیں؛ ایک یہ کہ فارسی ترکیب کے شعر کہے اور اس میں فعل و حروفِ اشارہ فقط ہندی رکھے۔ جیسے "کاو کاو سخت جانی . . . . . "
'نہ پوچھ' کی جگہ 'مپرس' ہوتا تو فارسی کا مصرع صاف تھا۔ بخلاف مومن خاں کے کہ ان کے مصرعے ایسے پیچیدہ الفاظ تعقیب و تعقید سے مملو ہوتے ہیں کہ جس سے مضمون میں پیچیدگی آجاتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ نہیں۔

دوسری صورت یہ کہ آخر عمر میں غالب نے محاورات اور سلاست کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی فارسی کا مذاق چھپا چھپا ایسا رکھا ہے کہ دل کو لبھالیتا ہے۔
مثالاً چند شعر دونوں طرز کے لکھتا ہوں :

طرز اوّل :

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

طرز دوم :

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو شباب میں

تو ہم لوگ غالب کو اچھا اس سبب سے سمجھتے ہیں کہ طرز، بندش اور صفائیِ بیان میں سب شعرائے دلی سے اعلیٰ اور زبانِ فارسی میں یکتا تھے۔ اب میں مثالاً ذوق، مومن، غالب کا کلام لکھتا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ غالب میں صفائی کیسی ہے اور ان دونوں میں گنجلک کیسی:

ذوق:

مزے یہ دل کے لیے تھے، نہ تھے زباں کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزشِ نہاں کے لیے

غالب:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

یا

محبت میں نہیں ہے فرق مرنے اور جینے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ مرتے ہیں (کذا)

مومن:

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُر ستم نکلے
جو وُہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

باقی رہی زباں دانی، ان کے سوائے چند محاورات خاص دہلی کے جس کے خود مرزا غالب قائل ہوئے ہیں، چہ غالب، چہ مومن، چہ نصیر وغیرہ سب دہلوی اور سب لکھنوی، کہیں کے رہنے والے ہوں بشرطیکہ انھوں نے لکھنؤ یا دہلی میں نشو و نما پائی ہو اور اساتذہ کے خاندان سے منسوب ہوں

اوّل درجے کے ہیں۔ اور دُوسرا محاورات میں درجہ عوام و خواص کا ہے اور تیسرا درجہ بازاریوں کا ہے۔

اور شہروں کے اعلیٰ ترین خواص . . . . اور بازاریوں سے تقابل نہیں . . . . اور یہی رائے انشاؔ اللہ خاں کی بھی ہے۔ مگر یہ بات فقط دہلی و لکھنؤ کے واسطے ہے۔ بہ سبب اجتماع اہل علم و فن کے، ایسی حالت میں قصباتی یا دوسرے شہر کے رہنے والوں کو تمام اہل دہلی و لکھنؤ کی تقلید جائز ہے مگر کسی بات میں محاورے اور تذکیر و تانیث میں جب تک اختلاف ان میں نہ ہو اور جس محاورے و تانیث و تذکیر میں اختلاف ہو اُس میں سے اُسی محاورے کو ماننا چاہیے جس مقام کی تقلید اسے پسند ہو، یعنی لکھنؤ کی، یا دہلی کی۔ مگر حالی نے کیا خوب کہا ہے:

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط، منہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت

مرقع فیض اور تنبیہ صفیر بلگرامی

گزشتہ صفحات میں تلامذۂ صفیر کے تذکرے "مرقع فیض" مصنفہ سلطان مرزا سلطان کا تعارف کرایا جاچکا ہے۔ اس تذکرے کے آخر میں صفیر کے نام غالب کے خطوط بھی شامل کیے گئے ہیں۔ خواجہ فخرالدین حسین سخن دہلوی جو صفیر کی شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے انھوں نے "مرقع فیض" کا جواب "تنبیہ صفیر بلگرامی" کے نام سے اپنے شاگرد سردار مرزا آزاد سے لکھوایا تھا جو مطبع محمدی پٹنہ سے ۱۲۹۶ھ میں طبع ہوا تھا۔ "تنبیہ" میں بعض مقامات پر غالب کا ذکر بھی آیا ہے۔ "مرقع فیض" میں سخن کے بارے میں لکھا ہے:

"حضرت استاد [صفیر] نے کوئی دقیقہ اُن کی تعلیم کا نہ چھوڑا اور شفقت بزرگانہ سے درنہ گزرے۔" (ص ۳۶)

سردار مرزا آزاد نے اس بیان کو غلط ٹھہراتے ہوئے سخن کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں غالب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"حضرت جناب نواب اسد اللہ خان غالب مرحوم و مغفور خواجہ صاحب [سخن] کے نانا تھے، اُن سے فارسی کی تکمیل کی۔ انھوں نے رموز شاعری کو بھی بتایا۔ مگر یہ فرمایا کہ ابھی شعر نہ کہو جب تک جمیع علوم کی تحصیل سے فراغت حاصل نہ ہو۔ مگر خواجہ صاحب اُن دنوں کسی اور ہی عالم میں تھے۔ اُن سے نہ رہا گیا اور شعر کہنے لگے۔ ایک غزل حضرت غالب

قدس سرہٗ کو دکھائی جس کا ایک شعر یہ ہے.....

سنبھالا ہوش تو مرنے لگے حسینوں پر
ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے

خواجہ صاحب کے نانا صاحب [غالب] نے خواجہ صاحب کو گلے لگایا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ "میری جان ایسا شعر نہ کہا کر د۔ ابھی تو تم نے ہوش بھی نہیں سنبھالا، دنیا میں کیا دیکھا بھالا۔ دیکھو عارفؔ ایسے ہی لختِ جگر گُھل گُھل کر دنیا سے ناشاد گیا۔ تم بھی زندگی سے بیزار ہو۔" غرض نہایت خفا ہوئے اور تاکید کی کہ "خبردار اب جو سُنوں گا کہ ایسا شعر کہا ہے تو سید تیری جان! اپنے ایمان کی قسم صورت سے بیزار ہو جاؤں گا۔" چونکہ حضرت خواجہ صاحب ان سے بہت ڈرتے تھے، شعر کہنا موقوف کیا اور 'مہر نیمروز' تاریخ فارسی جو خاص ان کے نانا کی تصنیف تھی، اُس کو تمام و کمال حضرت مصنف ہی سے پڑھا۔ اور کچھ رقعے 'پنج آہنگ' کے دیکھتے تھے کہ زمانے کا انقلاب ہوا اور خواجہ صاحب دہلی سے لکھنؤ آئے۔" (ص ۸۳-۸۲)۔

'مرقع فیض' میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ "سخن تخلص استاد [صفیر] ہی کا بخشا ہے۔" (ص ۳۶) سردار مرزا آزاد اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"سخن تخلص خواجہ صاحب کا اُن کے نانا نواب اسد اللہ خان غالب مرحوم نے رکھا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے..... قبل آنے آرہ کے جو غزل لکھنؤ میں لکھی اس کا مقطع یوں ہے.....

نام ہے ہند کا دہلی سے سخنؔ عالم میں
اور ہے حضرتِ غالب سے نشانِ دہلی

(ص ۹۵)

مرقع فیض" میں غالب کے جو خطوط درج کیے گئے ہیں، اُن پر تبصرہ

کرتے ہوئے آزاد لکھتے ہیں:

"اب یہاں سے حضرت نواب اسداللہ خاں غالب مرحوم کے کلام بلاغت نظام کے پہلو اور اس کی خوبیوں کا بیان لکھتا ہوں جو آپ کے نام کے خطوط میں مندرج ہیں جس سے آپ کی 'ہجوِ ملیح' صاف پائی جاتی ہے۔ مگر آپ اپنی سادہ لوحی سے اُس کو اپنی تعریف سمجھ رہے ہیں۔

عبارت مکتوب غالب ..... "آپ کی طرز نگارش نظماً[1] اور نثراً درخشندگی جوہر[2] سے خبر دیتی ہے۔"

توضیح: اس فقرے پر آپ بہت نازاں ہیں کہ مجھ کو بھی غالب نے ایسا لکھا۔ اور نہ سمجھے کہ اس دبیر جادو تحریر نے کیا لکھا۔ سُنیے اِس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے آپ ہیں ویسی ہی آپ کی نظم و نثر ہے۔ 'جوہر' کی کوئی صفت اس فقرے میں نہیں پائی جاتی ہے۔ یعنی جوہر کیسا، لطیف یا کثیف[3]۔ جب کوئی صفت اِس جوہر کی نہیں ہے تو ممکن ہے وہ جوہر لطیف نہ ہو بلکہ عکس اُس کا ہو۔ جوہر تو پتھر میں بھی ہوتا ہے، لکڑی میں بھی ہوتا ہے، لوہے میں بھی ہوتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر جب تک اس کی توضیح نہ کی جائے وہ جوہر نکمّا ہے۔ پس جوہر کے لفظ کے بعد صفتِ بیانیہ کا مفقود[4] ہونا اُس فقرے کے یہ معنی پیدا کرتا ہے کہ جس طرح کا جوہر آپ میں ہے آپ کی طرزِ تحریر اس سے خبر دیتی ہے۔ یعنی آپ کی تحریر نظم و نثر میں جو کچھ عیوب ہیں وہ تحریر ہی سے آشکارا ہیں۔

عبارت مکتوب غالب ..... "اشعار گھر بار دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ سب اچھے ہیں۔ مگر جو میرے دل میں اُتر گئے ہیں وہ تم کو لکھتا ہوں۔ صفیر:

ہائے وہ لب ہلا کے رہ جانا
ابھی کچھ بات کر نہیں آتی"

---

[1] مرقع فیض میں "او" ہے۔ [2] مرقع فیض میں "جوہر طبع" ہے۔ (ص ۳۶) [3] اصل: کسیفت
[4] اصل: متقصود

توضیح: جس شخص نے کچھ بھی شعر کہے ہوں گے یا جس نے دو چار دیوان ہی دیکھے ہوں گے یا جس نے دو چار مہینے کسی اہلِ زبان کی صحبت پائی ہوگی وہ ہرگز نہ یوں بولے گا نہ یوں لکھے گا کہ :

ابھی کچھ بات کر نہیں آتی

میں بآوازِ بلند کہتا ہوں کہ 'بات کر نہیں آتی' ہرگز محاورہ فصحائے دہلی اور لکھنؤ کا نہیں۔ جتنے اہلِ زبان ہیں وہ یوں بولتے ہیں اور جتنے شاعر ہیں وہ یوں لکھتے ہیں کہ تم کو بات کرنی نہیں آتی۔ ایسی فاش غلطی اور اس کو غالب یوں لکھے کہ 'یہ شعر دل میں اُتر گیا ہے' آپ کی ہجوِ ملیح نہیں ہے تو اور کیا ہے بھلا کبھی قیاس مقتضی اس بات کا ہو سکتا ہے کہ غالب نے اس غلطی پر نظر نہ کی ہو۔ صفیر :

ورق میں جوششِ مضمونِ گریہ سے بادل
بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

یہ شعر بھی حضرت غالب مرحوم کے دل میں اتر گیا ہے۔ کیوں کر نہ دل میں اتر جائے کہ وہ شعر ہی ایسا ہے۔ 'ژالہ' پر اطلاق آب کا کہیں نہیں آیا۔ ژالہ ایک شے متحجر ہے اور جب تک وہ متحجر ہے، آب نہیں ہے اور جب آب ہوا تو ژالہ نہیں ہے۔ پھر :

بسانِ ژالہ ہے ہر نقطۂ کتاب میں آب

کیونکر درست ہوا؟ اس مصرع کی ردیف بیکار رہ گئی، یا پانی ہو کر بہ گئی۔ تیسرا شعر آپ کا، وُہ بھی حضرت غالب کے دل میں اُتر گیا ہے۔ صفیر :

کہیں ہوں گرم کہیں سرد حسبِ موقع وقت
صفیر آگ میں ہوں آگ اور آب میں آب

توضیح: محالات کا خیال زندہ رہ کر عناصر کی طرف انتقال اور وہ بھی کبھی کبھی۔ اس کا نام شاعری نہیں ہے اِس کو سودا کہتے ہیں۔ آپ کی اس مہمل گوئی اور غلط بیانی پر غالب مرحوم نے وُہ فقرہ لکھا ہے کہ آپ کی طرزِ نگارش درخشندگیِ جوہر سے خبر دیتی ہے۔"

(ص ۱۷۔ ۱۱۴)

محشرستانِ خیال

صفیر کی یہ کتاب ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۹ء میں مطبع نورالانوار آرہ میں طبع
ہوئی تھی۔ اس میں ابتداءً ایک تمہید ہے۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل ابواب ہیں:

۱۔ بے مثل مثلیں

۲۔ دل پسند نکتے، سودمند نصیحتیں

۳۔ قطعات معقول، اشارات مقبول

۴۔ بلا عنوان۔ عنوان کی جگہ سادہ ہے۔ "محشرستانِ خیال" در اصل اسی باب کا عنوان
معلوم ہوتا ہے جو سہواً لکھنے سے رہ گیا ہے۔ اس میں ایک خیالی محفل سجائی ہے جس
میں مختلف شعرا اپنا کلام سناتے ہیں۔

۵۔ جلسۂ شعرا ایشیا اور یورپ کی شاعری میں۔ (اس میں یورپ اور ایشیا کے شعرا
شاعری کے بارے میں اپنے اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ یہ ایک خیالی محفل ہے)

بظاہر تو اس کتاب کا موضوع شعر و شاعری ہے، لیکن در اصل اس کا
مقصد ان شعرا کو مطعون کرنا ہے جو اپنے استادوں سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں متعدد
اشعار و واقعات درج کیے گئے ہیں۔ اس رسالے کا روئے سخن خواجہ فخرالدین سخن کی طرف ہے
جو صفیر کے شاگرد تھے اور پھر شاگردی سے منحرف ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے سرورق پر یہ معنی خیز

شعر درج کیا گیا ہے :

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

یہ رسالہ اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں یورپ اور ایشیا کی شاعری کا تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ گو اِس مطالعے میں گہرائی نہیں ہے، لیکن آج سے سو سال پہلے اِس موضوع پر اُردو میں کسی تحریر کا لکھا جانا قابلِ توجہ ہے۔ کتاب کے سرورق پر "حصّہ اول" لکھا ہے لیکن اِس کتاب کے کسی اور حصّے کے لکھے جانے یا طبع ہونے کا علم نہیں ہو سکا۔ گمانِ غالب یہی ہے کہ دُوسرا حصّہ لکھا ہی نہیں گیا۔

اس کتاب کا مرکزی کردار مرزا غالب ہیں۔ "میدانِ تصوّر" میں غالب ہی کے خیمے میں پہلے مشاعرہ ہوتا ہے اور پھر جلسہ۔ ان خیالی محفلوں کی روداد میں جہاں جہاں غالب کا ذکر آیا ہے، وُہ حصّے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر حواشی کے جو نشانات (نمبر شمار) درج کیے گئے ہیں، اُن کا تعلق اگلے باب سے ہے۔ قلابین میں وضاحتی عبارتیں مرتّب کا اضافہ ہیں۔

[ص ۲۵] ناگاہ میدانِ تصوّر میں ایک خیمہ بوقلموں نظر آیا۔ اُس کے سامنے ایک شامیانہ آسمان کی طرح دُور تک جنگل کو گھیرے، ساز و سامان، حاجب و دربان بہتیرے، امیرانہ بلکہ شاہانہ ٹھاٹ۔ اُس مقام کی جلالت و شوکت نے مجھے حیرت میں ڈالا۔ کس سے پوچھوں، کیا کروں۔ ایک قبول صورت جوان سامنے سے آتے دیکھا۔ پُوچھا یہ کون مقام ہے اور مالک خیمہ کا کیا نام ہے۔ اُس نے کہا "یہ وادیٔ عالمِ قدس مقام ارواح ہے، محشرستان خیال اس کو کہتے ہیں اور یہ خیمہ جناب نواب معلّی القاب دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ عرف مرزا نوشہ غالب تخلص [ص ۲۶] آگرہ موطن دہلی مسکن کا ہے۔ میں انھیں کے فرمانِ واجب الاذعان سے آیا ہُوں۔ چلیے آپ کو بلایا ہے۔"
میں نے کہا "مجھے۔ اللہ اللہ مدّت ہُوئی کہ زیارت سراپا بشارت سے محروم ہوں۔ خدا نے یہ دن دکھایا۔

بھئی رہبری کرو۔"

یہ کہہ کر اُسی طرف چلا[۲] - اُستاد کی آرزوئے قدم بوسی نے سمندِ ہمت کو تیز گام کیا۔ تھوڑی مسافت طے کر کے باریابِ حضوری ہوا اور سامنے پہنچ کر تسلیم بجالایا[۳]۔ فرمایا " مولوی صفیر صاحب آپ اچھے ہیں۔ کیا حال ہے۔ کچھ اداس سے نظر آتے ہیں۔ بھئی بہت جی چاہتا تھا۔ آیئے، بیٹھیے[۴]۔ ۱۲۸۲ھ میں جب آپ دہلی آئے تھے، ایک کتاب الفاظ مونث و مذکر کی تحقیق میں آپ نے لکھی تھی، اور میں نے اس کو دیکھ کر اس کی تقریظ بھی لکھ کر آپ کے نانا اپنے پیر و مرشد حضرت سید صاحب عالم صاحب کے پاس مارہرے بھیج دی تھی۔ وہ چھپی یا نہیں۔ بوستانِ خیال کا ترجمہ درست تو تھا، اُس کے چھپنے کی کیا صورت ہُوئی۔ افق الخیال تو ضرور تمام ہوگئی ہوگی۔ بھئی میں لکھ چکا ہوں کہ (پہلی جلد جس کا نام افق الخیال ہے، اُس کے دیکھنے کا بہت مشتاق ہوں۔ جناب میر ولایت علی صاحب کو تاکید رہے کہ جب اس کا چھاپا تمام ہو، بے طلب بھیج دیں) کیوں آپ نے یا انھوں نے کیوں نہ بھیجا۔ کیا اب تک چھپ نہیں چکی۔"

میں نے عرض کی" جناب آں قصہ را گاؤ خورد و گاؤ را قصاب برد۔ وہ کارخانہ ہی درہم برہم ہوگیا۔ نہ اب مطبع عظیم المطابع ہے نہ بوستانِ خیال کا چھپنا۔ صبح بہار° چوتھی جلد شروع ہو کر پانچ جزو چھپ کر ناتمام رہ گئی۔ قلتِ فرصت اور مکروہاتِ دنیا نے اور ہی عالم کر دیا ہے۔ میں اپنے مسکن پر چلا آیا۔ آج حضوری میں حاضر ہُوا۔"

فرمایا" مارہرے ہوتے آئے ہیں۔ میرے پیر و مرشد حضرت صاحب عالم اچھے ہیں۔" میں نے کہا: "ہاں بہت اچھے ہیں۔" حکم ہوا کچھ اپنی تازہ فکر سناؤ۔ مجھے اس وقت

---

[۵] قوسین اصل کے مطابق ہیں۔

° یہ چوتھی نہیں تیسری جلد ہے۔

مناسب معلوم ہُوا کہ جناب کنور سکھراج بہادر رحمتی عظیم آبادی کے دُوسرے مشاعرے کی غزل کے کچھ اشعار پڑھ سنائے۔[۵]

[اس کے بعد ص ۲۸-۲۷ پر ایک طویل غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

تو آکے دمِ نزع جو آغوش کشا ہو
دم نکلے تو بوئے گُلِ صد چاک قبا ہو]

[ص ۲۸] میں نے مقطع پڑھا تھا کہ ہٹو بچو بڑھو کی آواز کان میں آئی۔ دیکھتا کیا ہُوں کہ دو چار معزز زین خمیدہ قامت، پاکیزہ صورت جُبّہیں لیے، عبائیں پہنے، عمامے باندھے تشریف لائے۔ حضرت غالب نے دیکھ کر لبِ فرش تک استقبال کیا اور باعزاز تمام مسند پر بٹھایا۔ اللہ رے اُن عالی منشوں کا رعب داب کہ حضرت غالب سا شخص بھی مودب بیٹھا۔ میں دل میں حیران تھا کہ یہ کون لوگ ہیں، کس سے پُوچھوں، کہ حضرت غالب نے مجھے متحیّر پاکر ان کی طرف اشارا کیا اور فرمایا "یہ جناب رودکی، یہ اسدی، یہ عسجدی، یہ عنصری، یہ فردوسی، یہ غضایری ہیں۔" میں بھی اٹھ کر قدمبوس ہوا۔ انھوں نے اشارے سے مجھے پُوچھا۔ حضرت غالب نے فرمایا "یہ مولوی سیّد فرزند احمد صفیر حسینی واسطی بلگرامی ہیں، جہاں کے سادات گرامی ہیں۔ شعر و سخن میں مجھ سے مشورہ لیتے ہیں اور بہت خوب کہتے ہیں۔ طبیعت میں جودت، کلام میں متانت بہت ہے۔"[۶]

جناب رودکی نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کچھ اپنی [ص ۲۹] فکر تازہ سنائیے۔[۷] میں نے عرض کی "ایسے اساتذہ کے سامنے اپنے مزخرفات کو پڑھنے کی مجال نہیں مگر امتثالِ امر بھی ضرور ہے، سرتابی بھی گناہ ہے، اور پھر ایسے سخن فہم کہاں ملیں گے۔ جو نقد کلام یہاں پرکھا گیا پھر وہ رائج الوقت ہے"۔ یہ کہہ کر میں نے کچھ شعر جو یاد آئے سنائے۔

[اس کے بعد صفیر نے اپنے ۷۰ شعر ص ۲۹ سے ۳۲ تک درج کیے ہیں]

[ص ۳۳] میں یہ اشعار پڑھتا جاتا تھا، اور کمال شفقت سے اساتذہ

ولایت کے لیے ترجمان اس کے حضرت غالب تھے۔ وہ لوگ بھی اکثر مقام پر تعریف فرماتے تھے اور حضرت غالب تحسین وآفرین زبان پر لاتے تھے۔[۸] آخر جناب صائب اور عرفی نے فرمایا کہ کچھ اشعار معنی بند پڑھیے۔ مجھے یاد تو کم رہتا ہے، جو اس وقت یاد آئے پڑھ سنائے۔

[اس کے بعد صفیر نے اپنے ۳۲ شعر درج کیے ہیں جو ص ۳۳ سے ۳۵ تک ہیں]

[ص ۳۵] اللہ اللہ ان اشعار پر اساتذہ کا وجد، واہ واہ کی ایک دھوم تھی اور حضرت غالب "ماشاء اللہ چشم بد دور" فرماتے جاتے تھے۔ حضرت صائب نے فرمایا "فیضِ مبدٔ فیاض کسی پر بند نہیں:

یک عمر می تواں سخن از زلفِ یار گفت
در بند آں مباش کہ مضموں نماندہ است"۔

میں نے اساتذہ کو دونوں ہاتھوں سے تسلیم کی اور اُسی جوش میں چند اشعار اور پڑھے۔

[اس کے بعد صفیر نے اپنے ۱۴ شعر ص ۳۵ سے ص ۳۷ تک درج کیے ہیں]

[ص ۳۷] اِن اشعار کی تعریف بہت ہوئی اور اساتذہ کو بہت لطف ملا۔ حضرت غالب نے فرمایا "کچھ فارسی سناؤ"۔ میں نے عرض کی "حضور کس کے حضور۔ یہ اہلِ ولایت جن کی تقلید سے ہم لوگ فیض یاب ہوں، اُن کی زبان میں پڑھنا منہ چڑانا ہے۔" فرمایا "نہیں، کچھ پڑھو"۔ مجھے چند اشعار فارسی یاد تھے، سنائے۔

[اس کے بعد صفیر نے اپنے بارہ فارسی شعر ص ۳۷-۳۸ پر درج کیے ہیں]

[ص ۳۸] یہ اشعار سُن کر جملہ اساتذہ نے بہت داد دی اور حضرت غالب نے بہت سراہا۔ پھر حضرت غالب اُن اساتذہ کی طرف مخاطب ہوئے اور بولے کہ "جب تک مجمع ہو کچھ آپ لوگ اپنے افکار گہربار سے سرفراز فرمائیے۔" اول رودکی نے شروع کیا۔[۹]

[اس کے بعد ص ۳۸ سے ص ۴۲ تک رودکی، اسدی، عنصری، غضایری کے

اشعار ہیں۔ پھر عنصری، غضایری، رشید وطواط، خاقانی و ابوالعلا کے مناقشوں کا ذکر ہے]

[ص۴۲] لاحول ولا قوۃ۔ مجھے یہ سُن کر حیرت ہوئی اور ابوالعلا کی یہ حرکت ناپسند آئی۔ عارف شاگردِ غالب کہ میرے پاس بیٹھا تھا بولا "استاد بیچارہ کیا کرے، اُس کی ساری محنت برباد ہوئی۔ اُس پر طرّہ یہ ہے کہ شوخ چشمی سے مقابلہ کرنے کو تلا ہوا ہے۔" میں نے کہا "خیر ناسزا کا جواب ناسزا ہوتا ہے مگر مہذب کو لائق نہیں۔" اُدھر شعرائے متقدمین سر کو جھکائے سن رہے تھے۔ جب دونوں میں گفتگو ہو چکی، فردوسی نے فرمایا کہ "آپ لوگ آپس میں صلح کر لیجیے کہ اس سے کچھ حاصل نہیں"۔ غالب نے بھی تائید کی۔ ابوالعلا نے کہا "میں صاف دل ہوں مجھے کچھ عذر نہیں۔ مگر یہ نہیں مانیں گے کیونکہ مجھ سے یہ مقابلہ کرنے میں اپنا فروغ سمجھتے ہیں اور میں اُن محنتوں کو کیوں کر بھلا دُوں جو خاقانی پر کی ہیں۔"

غرض یہ گفتگو اسی قدر ہو کر رہ گئی۔ اتنے میں آذری، لساطی، کمال خجند، کاتبی، لسانی، شریف، حیدری، وحشی کا ورود ہُوا۔ مگر کمال خجند کی طرف سے بساطی کو کشیدگی اور لسانی سے شریف کو اور شریف سے حیدری کو رنجیدگی نظر آئی۔ میں نے دل میں کہا "یہ کیا معاملہ ہے، اساتذہ کا جب یہ حال ہے تو میرا کیا ٹھکانا"۔ بہرحال بعد مزاج پرسی غزل خوانی شروع ہوئی۔

[اس کے بعد ص ۴۳ سے ص ۵۰ تک متعدد شعرائے فارسی کا کلام ہے۔ درمیان میں جا بجا صفیر نے حاشیہ آرائی کی ہے]

[ص ۵۰] اللہ اللہ جب فارسی گویوں کی نوبت یہاں تک پہنچی اور سب نے ایک ہی رنگ میں گویا شکایت آمیز مناقشہ خیز اشعار پڑھے۔ سب کے بعد حضرت غالب کی زبان فارسی میں نوبت آئی۔ انھوں نے پہلے شکایت زمانہ اور اہلِ زمانہ بہت کچھ سنائی۔ بعد اس کے کچھ اشعار فارسی اپنے پڑھے۔

[اس کے بعد ص ۵۰ سے ص ۵۹ تک پہلے تو غالب کی وہ غزل درج ہے جس کا

مطلع یہ ہے:

از نکوئی نشاں نمی خواہسم
خویش را بد گماں نمی خواہسم

اس کے بعد انوری کے دو شعر ہیں۔ پھر شعرائے اردو اپنا کلام سناتے ہیں،
اسی ضمن میں بعض شاگردوں کے اپنے استادوں سے منحرف ہونے کے جھگڑے بھی
زیرِ بحث آتے ہیں]

[ص ۵۹] اتنے میں حضرت غالب بولے" بس قصے جھگڑے بہت ہوئے۔
مطلب رہا جاتا ہے۔ آپ لوگ ذرا خاموش ہوں تو میں عرض کروں اور جس مطلب کے لیے یہ انجمن جمع
ہوئی ہے، اُس کو بیان کروں۔" سب لوگ خاموش ہو کر متوجہ ہوئے۔

جلسۂ شعرا ایشیا اور یورپ کی شاعری میں

[ص ۶۰] جب شعرائے متقدمین اور متوسطین اور متاخرین فارسی اور
اردو کا مجمع ہو چکا اور ایک کیفیت کے ساتھ جو ایشیائی شاعری کے لیے موزوں تھی، اس جلسے کا
خوب رنگ جما۔ اُس وقت حضرت غالب نے رودکی، فردوسی، سعدی وغیرہ اساتذۂ مسلم الثبوت
سے کچھ ایسا فرمایا کہ میں نے اچھی طرح نہ سنا۔ ہاں ہاں کی صدا تو آئی اور
کچھ شعرا اٹھ کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کچھ انگریز پیرانِ کہن سال واردِ جلسہ ہوئے۔ اُن کی تعظیم کو سب
شعرا اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کو معزز مقام پر بٹھایا۔ میں پھر متحیر ہوا۔ حضرت غالب نے میرے
کان میں جھک کر اتنا فرمایا کہ یہ سب شعرائے فرنگ ہیں۔ یہ کہہ کر وُہ اُدھر متوجہ ہوئے۔ میں نے عارف
سے پُوچھا" بھئی آج یہ مجمع کس لیے منعقد ہوا ہے۔" وہ بولے" دیکھتے جائیے، آپ ہی معلوم ہو جائے گا۔"
اتنے میں حضرت غالب نے اُٹھ کر بآوازِ بلند فرمایا کہ:

اے حکمائے بافرہنگ اور شعرائے با نام و ننگ! آپ لوگ جانتے ہیں کہ
آج تکلیف دینے کا [ص ۶۱] سبب کیا ہے۔ یہ ہے کہ ایشیا کی شاعری اور یورپ کی شاعری کا

فرق دکھایا جائے۔ اور ایشیائی شاعری میں بقدرِ ضرورت اصلاح کی جائے تاکہ ہم لوگوں پر جو مضحکے ہوتے ہیں اُس کی جگہ نہ رہے۔ اور مجھے خاص کر اس امر میں دخل دینے کا باعث یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایک شخص کو ممتاز فرمایا ہے، اور اُس کا انتظام اُسی کے علاقے کیا ہے۔ جناب رودکی سے لے کر خاقانی و سنائی و انوری وغیرہم تک ایک وضع کے لوگ رہے۔ پھر حضرت سعدی اور جامی اور ہلالی کا دورہ رہا۔ پھر فغانی اور ظہوری اور نظیری اور عرفی اور نوعی نے ملکِ سخن میں حکومت کی۔ پھر صائب و کلیم و سلیم و قدسی و شفائی نے دادِ سخن دی۔ اب اِس اخیر زمانے میں کہ مبدءِ فیاض نے اِس ہیچمداں کو ممتاز فرمایا ہے اور کشورِ سخن کی حراست مجھ کو عطا ہوئی ہے، میرے ہم عصر غیر ملک والے جو نقص نکالیں، اُس کا جواب میرے ذمے ہے۔

لامحالہ مجھ کو اہتمام کرنا پڑا کہ میں ایشیا اور یورپ کی شاعری کو ملا کر انصاف کروں اور آپ لوگوں کے سامنے حک و اصلاح کی صورت نکالوں کیونکہ اُن کے کہنے کے قطع نظر میں دیکھتا بھی ہوں کہ باوجود اس قدر ترقی کے ایشیا کی شاعری میں چند نقص بدیہی ہیں جن کا نکالا جانا ضروری ہے۔ جیسے اس مجمع میں چند شعرائے نامآور کا آپس میں گفتگو ملال آمیز کرنا اور اس حرکتِ ناملایم کو کہ اہلِ کمال کے لیے ہرگز زیبا نہیں، اچھا سمجھنا۔ اسی قبیل کی اور بھی باتیں ہیں جو اپنے موقع پر بیان ہوں گی۔ اور یہ سب باعث ہماری کم توجہی کا ہے کیونکہ ہم اچھی طرح سے دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم نے تمام بنی نوعِ انسان کو جمیع مخلوقات میں ممتاز کیا ہے اور اُن میں سے اہلِ عقل و ادراک کو منتخب اور ان میں سے حکما کو سربلند اور ان میں سے شعرا کو اپنے فیضِ خاص سے بہرہ مند فرمایا ہے۔ تو شعرا حکیموں سے دوسرے درجے میں ہیں بلکہ بہت سی باتوں میں اُن کے شریک۔ باوجود اس کے ان لوگوں میں نقص کا برتاؤ ہونا حیف کا مقام ہے۔

[ص ۶۲] پیغمبروں کا مرتبہ اگرچہ بہت اعلیٰ ہے مگر شعرا اُن سے تیسرے درجے میں ہیں۔ جناب عطار نے کیا خوب فرمایا ہے:

شاعری رمزلیست از پیغمبری

اور سبب اس کا یہ ہے کہ پیغمبر اور حکیم اور شاعر کا منصب یہ ہے کہ جمیع حقائق اشیا اور کیفیاتِ دنیا سے واقف ہو۔ پیغمبر تو اس لیے کہ انسانوں کا روحانی مصلح ہو اور حکیم اس لیے کہ آدمیوں کی جسمانی اصلاح کرے۔ اور شاعر اس واسطے کہ لوگوں کی طبیعت اور خیالات کو اپنے بیان کی خوبی سے قوت اور تازگی بخشے۔ ان تینوں میں پیغمبروں کا مرتبہ اعلیٰ اس سبب سے ہے کہ اُن کی معلومات بغیر سیکھے اور کسی کے سکھائے منجانب اللہ وہبی ہوتی ہے۔ اور حکما اور شعرا بدون تعلیم کے کچھ جان نہیں سکتے۔ اور شاعری کیا چیز ہے، اُسی معلومات کا بیان کرنا، اُس حسن کے ساتھ جو سُننے والے کے دل میں اثر کرے۔ اور اشاراتِ مناسب مقام کا استعمال کرنا جو اس تاثیر کے برا العین دکھانے کے لیے معیّن ہوں۔ پس تعجب ہے کہ شاعری اخلاقِ نیک کی معیّن ہو اور اُس کو اخلاقِ بد سے آلودہ کرنا گویا موتی کو کیچڑ میں ڈالنا ہے۔

اگرچہ شاعری کا ملکہ بھی وہبی ہے مگر انسان کو اس کے لیے محنت بھی کرنی پڑتی ہے تاکہ انبیا سے فرق رہے۔ مگر نادانوں نے شاعری کو دروغ کا ماخذ سمجھ لیا ہے۔ اور چونکہ مبدٔ فیاض کے فیض عام سے مثل اور قوتوں کے ہر انسان کو قوتِ شاعری بھی ملی ہے، گو بدون تائید روح القدس وہ قوت اپنا اصلی کام نہیں دے سکتی جس کو روح القدس سے علاقہ نہیں ہوتا، وہ فقط الفاظ بافی کو اصلی شاعری سمجھ کر شعرا کا منہ چڑاتے ہیں اور عوام کالانعام اصلی اور نقلی میں فرق نہ کرکے دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ آخر انھیں لوگوں نے اس چشمۂ صاف کو غلظت سے بھر دیا اور ان کی اس قدر کثرت ہوئی کہ اصلی شاعری پردۂ اختفا میں آگئی۔

جب خداوند تعالیٰ نے انسان کو نطق کے ذریعے سے ممتاز کیا اور حواسوں سے [ص ۶۳] سرفراز، تو وہ خیالات اور حقائق جو انسان کو بذریعہ حواس معلوم ہُوئے، اُن کے اظہار کا ذریعہ نطق گردانا گیا۔ اور نطق کی خُوبی یہ ٹھہری کہ وارداتِ خواطر کو مقتضائے حال کے مطابق ظاہر کرے اور یہی شاعری ہے۔ اس صورت میں جمیع انسان شاعر ہیں۔ پھر اُس نطق کے ساتھ طبیعت کی موزونی بھی شامل ہُوئی تاکہ اُن وارداتِ خاطر کو انتظام کے ساتھ ظاہر کرے، اور یہ نطق کی آرایش ٹھہری۔ پس نظم اِسی سے مراد ہے۔ اور بموجب مثل گانا اور رونا کس کو نہیں آتا،

اس میں بھی جمیع انسان شریک ہیں۔ اگر کام میں لائیں تو ناظم ہو سکتے ہیں، اور کام میں نہ لائیں تو صرف شاعر تو لامحالہ سب ہیں۔ اب اُس نطق سے کہ اصلی شاعری ہے، خیالات نیک ظاہر کریں تو حکیم ہیں، اور اگر خیالات بد کو ظاہر کریں تو بدچلن۔

اور چونکہ نفسِ امّارہ کے سبب اگر انسان کی طبیعت روکی نہ جائے، شرارت کی طرف میلان زیادہ ہوتا ہے، ہر زمانے میں شریروں کی کثرت ہوگئی، اور وہ سب بھی شاعر ہی کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس لیے یہ لفظ بدنام ہوگیا، اور اچھے لوگوں کو اِس نام سے ننگ ضروری ہوگیا کہ مقصود اِس کا عوام میں صرف جھوٹ بولنا ٹھہرا۔ چنانچہ حضرت نظامی بھی اس مقولۂ عام کی نسبت فرماتے ہیں:

در شعر مپیچ و در فنِ او
چوں اکذبِ اوست احسنِ او

یعنی نزد عوام کالانعام جتنا دروغ ہوگا، اُتنا شاعری کو فروغ۔ پس انبیا علیہم السلام کہ معلّمِ بندگانِ الٰہی ہیں اُن کو ایسی شاعری سے علیحدہ رہنا ضرور ہُوا۔ اسی لیے خداوند تعالیٰ نے اپنے کلام مجید میں نسبت آنحضرت صلعم کی فرمایا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ الخ اور وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الّا وحی یوحیٰ۔ ورنہ اگر عوام شریر اپنے نطق کو کہ حقائق کے بیان کرنے کا آلہ ہے، کذب سے آلودہ نہ کرتے تو دنیا میں سوائے سچائی کے دُوسری بات نہ ہوتی۔

اوّل اوّل جب دنیا آباد ہوئی ہے اور نطق سے کام لیا گیا ہے، سچائی تھی اور بیشک چونکہ انسان عبادتِ الٰہی کے لیے پیدا ہوا ہے، اس نطق کو کہ اصل میں [ص ۶۴] شاعری ہے اور انسان کو موزونیت طبعی کے ذریعے سے اظہار کرنے کی قوّت بھی ملی، اور بیشک تقریر کا کہ نطق اُسی سے مراد ہے، موزوں ہونا تاثیر ور ہوتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سچائی کے زمانے میں عبادتِ الٰہی کہ مقصودِ خلقتِ انسانی ہے، بذریعہ موزونیت ہوتی ہو، اور ادعیات اور مناجات کی موزونی باعثِ قبولیت ہوتی ہو۔ کیونکہ موزونیت دو قسم کی ہے۔ ایک نثر اور دوسری نظم۔ نثر کا میں الفاظ کا

مناسب مقام آنا جس سے تاثیر کا وجود قائم ہو، مراد ہے۔ مگر اِس میں الفاظ کی کثرت ہو جاتی ہے، اور نظم میں وہی باتیں ساتھ قلتِ الفاظ کے۔ اور چونکہ الفاظ قلیل میں بڑے مطلب کا بیان کرنا ساتھ شرط تاثیر کے محنت کا کام ہے، اس لیے ناظم نثار سے فوقیت رکھتا ہے۔

پس سچائی کے زمانے میں عبادتِ الٰہی میں دعاؤں اور مناجات کا بیان ہونا (کہ عبادت اسی سے مراد ہے) شاعری سے خالی نہیں۔ اور چونکہ یہ عبادت کا ذریعہ ہی تھا اس لیے شاعری کے نام سے موسوم نہ ہوا ہو۔ اُس وقت کے بعد جب کذب کا وجود بھی ہوا تو اُس وقت میں حکما کہ جن کا درجہ بعد انبیا کے ہے، انسانوں میں ہی منفرد ہوئے۔ اور انھوں نے واسطے آگاہی، راستی اور ترکِ ناراستی کے حقائق جو اُن کو معلوم ہوئے بذریعہ نظم بیان کیے۔ اور چونکہ نظم میں تاثیر زیادہ ہے، اس لیے اُن کے نزدیک بیانِ رموزِ علوم وفنون کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔ اور اُس وقت میں فقط نظم پر اطلاق شاعری کا ہوا، اور اسی نام سے شہرت ہوئی۔

حکمائے سابقین سب شاعر تھے۔ جب غیر حکما نے نظم کی کیفیت معلوم کی، اور اس کی مشق کی تو اپنے خیالات فاسدہ بھرنے لگے تو حکما نے شاعری کے نام سے ننگ کیا اور علما نے اختیار فرمایا اور علوم وفنون کا بیان اسی کے ذریعے سے کرتے رہے۔ جب خواص نے اس کو اختیار کیا تو علما نے اِس سے ہاتھ اٹھایا اور یہاں فقط وارداتِ خاطر اور واقعات اور مدحیات کا عمل ہوتا رہا۔ جب عوام نے اس کو اڑایا [ص ۶۵] تو خواص نے ہاتھ اٹھایا۔ اب عوام خیالاتِ عشقیہ کو اس میں باندھنے لگے۔ کیونکہ معلوماتِ علوم وفنون تو رہی نہیں۔ اور جب عوام سے نیچے درجے والوں نے لیا تو ہزلیات کا دخل بدرجۂ اتم ہوا۔ مگر سابق میں رذالت کم تھی، بڑھتے بڑھتے اِس زمانے میں نوبت بہ اینجا رسید کہ ایشیائی شاعری کی صورت ہی بدل گئی۔ اور اس قدر اِن دونوں اخیر وضع کا چرچا ہوا کہ اب کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ایسی معقول چیز سے کوئی نفع مترتب ہو سکتا ہے۔ گو آگے بھی اس کا برتاؤ تھا مگر بہت کم۔

اِس زمانے میں تو شاعری کا مقصود ہی اُڑ گیا۔ اور جو لوگ ایشیائی شاعری

کو ناپسند کرتے ہیں، اُن کے لیے ایک مضحکے کی دلیل ہوگئی۔ حالانکہ جس شاعری کو وہ لوگ پسند کرتے ہیں، وہ بھی اس میں موجود ہے، مگر ایسی چھپی ہوئی ہے کہ تمیز میں نہیں آسکتی۔ اور اپنے برتنے والوں کی حقارت کے سبب جس جس طرح اس کی ترقی ہوئی، اور پستی ہوتی گئی، اور اب تو خاک کے برابر ہو چلی۔ اور بظاہر نفع سے خالی ہوجانے کے سبب سے اب لوگوں کی نظروں میں حقیر ہوگئی ہے:

مرتبہ کم حرص رفعت سے ہمارا ہو گیا
آفتاب اتنا ہوا اُونچا کہ تارا ہو گیا

پس اے رموز شناسانِ سخن! میں آپ لوگوں سے ملتجی ہوں کہ آپ لوگوں کی کوششوں کے احسان جیسے اور امور میں اہل عالم پر ہیں، اِس ذریعے سے بھی ہوں، اور ایشیائی شاعروں کو راہِ نیک پر لانے کی کوشش کیجیے اور رذالت سے بچائیے کہ آپ لوگوں پر عوام کالانعام کا حق ہے۔ اب میں چاہتا ہُوں کہ آپ لوگوں کے وسیلے سے ان امورات کی اصلاح میں کوشش کروں اور اس نقش کو مٹنے نہ دُوں، اگر خداوند تعالیٰ چاہے۔

پس پہلے التماس ہے کہ جو جو ایشیائی شاعری پر اعتراض ہیں، اُن کا اظہار فرمائیں، اور اس میں اگر ضرورت ہو، اصلاح کرکے ہم لوگوں کو طعنوں سے بچائیں۔ خدا میری اس سعی کو مشکور کرے۔

یہ کہہ کر [غالب] بیٹھ گئے

[ص ۶۶] شیکسپیر نے کھڑے ہو کر کہا، آپ نے بہت اچھی تقریر کی۔ اور رفاہ عام اور دردمندی اسی کا نام ہے۔ اور ہم لوگوں کو مناسب یہی ہے کہ اس کی اصلاح کی کوئی صورت نکالیں۔ مگر ایشیا سے اِس شاعری کا جانا بہت دشوار ہے کیونکہ یہ صدہا برس سے عوام کے زیر مشق ہو رہی ہے، اور لوگوں کے خیالات بھی ویسے ہی ہو گئے ہیں۔

مسٹر جانسن نے کہا کہ اب خیالات اور عادات کے بدلنے کا وقت ہے۔ ہمارے یورپ میں ایسے خیالات اور عادات کی کیا کمی تھی، آخر اصلاح پذیر ہوتے یا نہیں۔ اور اگر

کوشش کی جائے تو اصلاح ہوسکتی ہے کیونکہ سابقین سے لاحقین کی معلومات زیادہ ہوتی ہے* (ایک حکیم کا قول ہے کہ ہم اگلوں سے اچھے ہیں کیونکہ اُن کی پکی پکائی ہانڈی بھی کھائی اور آپ بھی پکائی۔ یعنی ان کے تجربے بھی بذریعہ تحریر معلوم ہوئے اور ہم نے بھی اپنے وقت میں تجربے حاصل کیے، اور آج دنیا کی ترقی کی وجہ یہی ہے) ممکن ہے کہ ایشیائی شاعری میں بھی اصلاح ہو جائے، اور اصلاح ہونے پر ترقی ہو مگر میرے نزدیک یورپ میں ترقی اصلی ہوئی ہے، اور ایشیا میں ترقیِ معکوس۔ یعنی تکلف تو بہت کچھ بڑھایا گیا مگر مضامین میں ابتری کچھ اور بڑھتی گئی۔

حضرت غالب نے کہا، نہیں سب کے مضمون ایسے نہیں ہیں، بلکہ کوئی شاعر ایسا نہیں کہ یورپ کی شاعری سے بے بہرہ ہو مگر کم۔ اُن میں اہلِ دانست قلیل اور نادانستہ کثیر، اور بے قصد تو سب حقیقی شاعری کچھ نہ کچھ کر جاتے ہیں، اور ہمارے یہاں اُسی کا نام آمد ہے۔

بیرن [بائرن] صاحب بولے جو نیچر کے مطابق ہو وہی شاعری ہے۔ اور ایشیا میں ایسے لوگ بہت ہیں۔

حضرت غالب نے کہا، آگے ایسے بہت تھے، اب معدودے چند ہیں۔ مگر اصلی شاعری کا جزو ایشیائی شاعری میں ملا ہوا ہے۔ اور چونکہ ایشیائی شاعری میں بسبب ایک رمز کے لطف بہت ہے تو اصلی شاعری کا جلوہ چھپا ہی ہے۔ اور میں یقینی کہہ سکتا ہوں کہ ایشیائی شاعری [ص ۶۷] ہر مقام کے خیالات کی جامع ہے مگر اس میں کدورت کذب کی مل جانے سے خرابی واقع ہوگئی ہے۔ تواریخ سے ثابت ہے کہ ابتدا شاعری کی ایشیا سے ہوئی کیونکہ پہلے آبادی دنیا میں ایشیا ہی سے شروع ہوئی ہے۔ اور شاعری کیا چیز ہے، اس کے دلائل میں پہلے بیان کر چکا ہوں۔

مارشمن [MARSHMAN] صاحب بولے، البتہ تواریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا ماخذ جمیع آبادی کا ہے۔ مجھ سے سُنیے۔

شروع پیدائش میں خدا نے زمین اور آسمان کو بنایا اور خاک سے انسان کو

---

* قوسین مطابق اصل ہیں۔

پیدا کر کے پیرایۂ عقل سے سرفراز کیا تا کہ بوسیلہ عبادت اپنے پیدا کنندہ کے قابل حاصل کرنے کیفیات روحانی کے ہو۔ بدن آدم پہلے مرد سے خدا نے حوا پہلی عورت کو بنایا۔ یہ دونوں بہ آرام اور بے گناہی تمام زندگانی کرتے رہے مگر بسبب نافرماں برداری اپنے معبود کی وہ حاصل کرنے عنایات اور شفقت اس کی سے باز رہے، اور اپنے کو اور جمیع اپنی اولاد کو خرابی میں ڈال دیا۔ اس طرح سے گناہ نے دنیا میں قدم رکھا، اور بے گناہی وہاں سے جاتی رہی۔

ہر ایک قوم کو کچھ جزوی حال زمانہ پیشینیہ کا جو کہ زمانہ پاکی کا کہلاتا ہے، معلوم ہے۔ اہلِ ہند اس کو ست جگ کہتے ہیں۔ اور درمیان یونانیوں کے وہ "سوکی کی یک"] سے نامزد ہے۔ انجیل سے دریافت ہوتا ہے کہ آدم اور حوا باغِ عدن سے جہاں انھوں نے عیش اور عشرت حاصل کی، نکالے گئے۔ اور ان کو یہ حکم ہوا کہ بوسیلۂ محنت اپنے ہاتھوں کی بسر اوقات کریں۔ اس حالت سخت میں اُن کی اولاد اب تک گرفتار ہے۔ آدم اور حوا سے کین [CAIN] یعنی قابیل اور اے بل [ABEL] یعنی ہابیل پیدا ہوئے۔ اے بل پاکباز اور خدا دوست تھا اور کین مغرور اور سرکش۔ ان دونوں نے قربانی بنام اپنے خدا ادا کی۔ خدا نے قربانیٔ اے بل کو قبول اور کین کو ناپسند اور رد کیا۔ اس لیے کین نے جوشِ غضب میں آکر اپنے بھائی کو مار ڈالا اور اس طرح سے زمین اوّل مرتبہ حضرت آدم اور حوا کی پہلی پیدائش کے خون سے آلودہ ہوئی۔

آدم اور [ص ۶۸] حوا سے اور اولاد پیدا ہوئی اور گروہ انسان کا ترقی میں آیا۔ اس نظر سے کہ آبادی جلدی سے ہو، خدا نے عمر آدمی کی ایک ہزار سال کی رکھی مگر آہستہ آہستہ اس کو اتنا کم کیا کہ زمانۂ حال میں صرف ستر سال کی رہ گئی۔ ہمراہ ترقی گروہ انسان کی ناپاکی اور بے ایمانی بھی زیادہ ہوئی۔ اگرچہ خدائے تعالیٰ نے اوّل برداشت مفسدین کی فرمائی مگر آخر کو اس نے ارادہ مار ڈالنے اس برگشتہ گروہ کا کیا اور حضرت نوح علیہ السلام کو مع اُس کے خاندان کے بہ ارادہ دوبارہ آباد کرنے دنیا کے اس آفتِ ناگہانی سے محفوظ رکھا۔ یہ زمانہ اوّل آبادی

دنیا کا ہے۔

آخر نوح مع اپنی بی بی اور تین بیٹے مع ان کی بیبیوں کے اور ہر جاندار چیز سے ایک ایک جوڑا لے کر کشتی میں سوار ہوئے۔ اور سمندر کی سوتیں کھل گئیں اور پانی زمین سے اُبلا اور آسمان سے برسا کہ جتنے زندے روئے زمین پر تھے سب نابُود ہو گئے۔ بعد اس کے خدا نے حکم بند ہونے مینہ کا دیا اور تمام پانی اتر گیا۔ کشتی نوح کی کوہ اراراب [اراراط] کے اوپر جس کو جودی کہتے ہیں ٹھہری۔ اور اس کو جغرافیہ والے آرمینیا میں قرار دیتے ہیں۔ مگر گمان غالب یہ ہے کہ وہ پہاڑ بیچ کسی ضلع بلخ کے جو جانب شمال مائل بجنوب ہند کے ہے، واقع ہے۔

تقسیم ربع مسکون کی مہندسان فرنگ نے پانچ حصوں پر کی ہے۔ اوّل ایشیا، دوم افریقہ، سوم یورپ، چہارم امریکا، پنجم اسطرل [سنٹرل] ایشیا۔ اور روس ایشیا اور یورپ دونوں میں شامل ہے۔ پس حضرت نوح کوہ اراراب [اراراط] پر ٹھہرے تو کوہ مذکور ملک فارس میں واقع ہے اور ملک آرمینیا ایشیائی روس میں ہے۔ اب کوہ مذکور ضلع بلخ میں قرار دیا جائے جس پر گمان غالب ہے تو بلخ ملک تاتار میں ہے اور سمرقند اور بخارا اور ترکستان اور خوارزم میں شامل اور ملک تاتار مع ہندوستان اور تبت اور چین اور ماچین اور آوا اور خراسان اور مازندران اور ایران [ص ۶۹] اور عربستان اور ترکستان ایشیا میں داخل ہیں۔ بہرحال کوہ اراراب [اراراط] جو مسکن حضرت نوح کا ہے، ہر طرح سے ایشیا میں شامل ہے۔ اس رُو سے اوّل مسکن انسان کا بعد طوفان کے ایشیا ٹھہرا۔ حضرت نوح نے کشتی سے اتر کر ایک قربانی بطور شکر یہ اپنے بچ جانے کی اِس مرگ عام سے ادا کی۔ اور جمیع ذی حیاتوں کو جو اُن کی کشتی میں تھے بموجب حکم خدا رہا کر دیا۔

زمین نے تری اور تازگی حاصل کی تھی۔ نباتات بکثرت پیدا ہوئے اور حیوانات خونخوار تمام زمین پر پھیل گئے۔ مگر گروہ انسان کا ایک ہی جگہ رہا۔ روز بروز آدمی زیادہ ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ ایک ہی مقام میں ساتھ آرام اور فارغ بالی کے رہ نہ سکے۔

ان میں سے ایک گروہ پانچ ہزار آدمیوں کا بہ ارادہ بسنے کسی جگہ کے اپنے بزرگ حضرت نوح سے جدا ہوا اور رفتہ رفتہ مغرب کی طرف سفر کر کے میدان بابل یا شنار میں وارد ہوا۔ حضرت نوح غالباً اُسی جگہ جہاں کشتی ٹھہری تھی، رہے۔ اور اُن کی اولاد نے ہند اور چین اور ہمسائے کے ملکوں کو بسایا۔ یہ کیفیت آبادی دنیا کی ہے۔ اور اسی طرح لوگ بڑھتے گئے اور دنیا آباد ہوتی گئی۔

یہ کہہ کر مارشمن صاحب نے سکوت اختیار کیا۔

اس کے بعد حضرت غالب نے کھڑے ہو کر فرمایا: اے واقف کارانِ روئے زمین! مارشمن صاحب کی اس تقریر سے میرا مدعا اچھی طرح ثابت ہُوا اور میں اُن کی تقریر سے اپنا مطلب پایۂ ثبوت کو پہنچاتا ہوں۔

سب سے پہلے پیدا ہونا انسان کا خدا کی عبادت اور اطاعت کے لیے ہے

چونکہ انسان مجموعۂ کمالاتِ کثیرہ ہے اور اس کے ساتھ محتاج اعانتِ غیر کا بھی ہے اور یہی سبب ہے کہ انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے، کس لیے کہ اعانت کا مدار رکھتا ہے اور بے اعانت کے رہ بھی نہیں سکتا ہے۔ اور یہ بہت باریک ثبوت خدا کی بندگی کا ہے [ص ۷۰] کہ جب ایسا مجموعۂ کمالاتِ کثیرہ اور صاحبِ نفسِ امارہ کہ سرکشی بھی ساتھ کمالات کے اس میں انتہا کی ہے:

آدمی زادہ طرفہ معجون است
کز ملایک سرشتہ وز حیوان
گر کند میل این شود کم ازین
ور کند میل آن شود بہ ازان

اپنے ہم جنس کے آگے اپنی مطلب روائی کے لیے سر جھکا سکتا ہے تو اُس خالق بے ہمتا کے آگے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور جو کہ ہر طرح اطاعت کرنے کے قابل ہے کیوں کر سر نہ جھکائے گا۔ پس ساتھ سرکشی کے محتاجی انسان کی اعجوبہ بات ہے۔ اور محتاجی اس کی دو طرح کی ہے۔ ایک

جسمانی دوسری روحانی۔ اوّل ہی محتاجی میں جس میں اوروں کی طرح خود بھی شریک ہے، اتنا زور شور ہے کہ جس نے اپنے ہی ہم جنس کا مطیع کر دیا اور لامحالہ اطاعت کرنی ضرور ہو گئی۔ دُوسری محتاجی جس میں نہ اپنا زور ہے نہ دُوسرے ہم جنس کا مقدور، بدرجۂ اولیٰ قوی بلکہ قوی تر ہو گی۔ اُس کا ٹھکانا کہاں اور وہ احتیاج بھی ہر ایک کو ضروری ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ یہ مسئلہ مسلّم ہے کہ انسان کو لاوجود بات کا وہم نہیں بندھ سکتا اور قیاس میں نہیں آسکتی:

محیط است علمِ ملک بر بسیط
قیاسِ تو بر وے نگردد محیط

پس احتیاج دوم جس کا انجاح انسان کی قدرت سے باہر ہے کیونکہ اس کا خیال بندھ سکتا ہے، اور یہ حاجت انسان کی درجہ بدرجہ ہوتی ہے۔ جیسے اہلِ دنیا کی حاجت، مال اور اولاد کا بہت ہونا، اور ایسے لوگ بہت ہیں۔ اور اہلِ دین کی حاجت، خوشنودی خدا کی اُن کے افعال سے اور اُس کے عوض میں بہشت کی امیدواری۔ اور حکیموں کی حاجت کمالِ حقایق کو پہنچ جانا اور اُس سے کیفیاتِ روحانی کا حاصل کرنا۔ اہل اللہ کی حاجت فنا فی اللہ ہونا۔ دیکھیے تو دنیا میں انھیں چار قسم کی حاجتوں کے لوگ ہیں اور جب اس کا خیال اہلِ دنیا کے دلوں میں ضرور آتا ہے تو اُس کا روا کرنے والا بھی ضرور ہو گا کہ ہر ضرورت کا رفع ہونا بھی خواہشِ انسانی میں ہے۔ اور جب صورت رفع نہ ہو تو اس کا خیال بھی [ص ۱۰] نہ آئے گا کیوں کہ مسئلہ مسلّم اوپر بیان ہو چکا ہے۔

جب یہ ثابت ہوا تو احتیاج روحانی کہ جس کا رفع کرنا انسان کی قدرت سے باہر ہے، اُس کے لیے کوئی غیر انسان صاحبِ اختیار ہونا چاہیے۔ اور یہ بھی ثابت ہے کہ جمیع مخلوقات میں انسان افضل ہے، پھر ایسا کون ہے جو انسان کی ایسی حاجت کو روا کرے۔ مگر وہی واجب الوجود ہے جس کے ہاتھ میں اُن حاجتوں کا روا کرنا آسان ہے اور یہ وہی مادہ اطاعت کا ہے جو خدا نے اپنی بندگی کے لیے انسان کو بخشا ہے اور اپنے کلام مجید میں فرمایا ہے ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون۔ اور ایسے سرکش کو ایسا خیال ضروری دے کہ اپنی بندگی میں سرگرم ہونے کی

تدبیر کی کہ اہلِ دنیا و دین زندگی میں یا مرنے کے بعد اس کے حاجت مند ہیں۔ اور وہ انسان کی معذوری اور یہ محض مجبوری اور بے کسی کا وقت ہے۔ پس یہ حاجت جمیع انسان کے دل سے لگی ہے۔ اور چونکہ احتیاج حاجت روا کی اطاعت کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور جو کہ حاجت کو روا کرتا ہے وہ محتاج کا محبوب ہوتا ہے، اس لیے انسان کا محبوبِ حقیقی خداوند جل شانہٗ ہے۔

اور دلیل اس پر یہ ہے کہ انسان جو انسان کی اطاعت کرتا ہے، اُس سے نفع وہیں تک پاتا ہے جو انسان کے اختیار میں ہے، اور اُس سے زیادہ نفع ممکن نہیں۔ اور انسان جب اُس نفع کا طالب ہوتا ہے جو انسان کی قدرت سے باہر ہے، پس اس کو ایک طرح کا غلجان ہوتا ہے کیونکہ وہ نفع سب نفعوں سے بالا ہے، اور لذّت اور لطف اس کا سب سے زیادہ۔ اور چونکہ انسان کو اپنے مطالب پر جب تک سب روا نہ ہوں سیری بھی نہیں ہوتی، اس لیے اُس کی طلب کو قوت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور ایسے مطالب کے روا ہونے کی صورت میں انسان میں نہ پائی جائے تو لامحالہ رجوع کرے گا غیر انسان کی طرف اور اُس کو ڈھونڈے گا۔ اور یہی سبب کم عقلوں کی عجائب پرستی کا ہے۔

اور عاقل جب عجائب چیزوں کو بھی محتاج پاتے ہیں تو [ص ۲،] رجوع کرتے ہیں اُس معبودِ حقیقی کی طرف۔ اور یہ حکمت اُس حکیمِ مطلق کی ہے کہ اپنی طرف رجوع ہونے کا آلہ ایسے مطالب کو بنایا ہے جو خواہ مخواہ انسان کو اُدھر کھینچ لے جاتا ہے اور وہی رغبت خدا کو پہچنواتی ہے۔ اب پہچان کی صورت اپنی دانست اور اپنی تمیز پر منحصر ہے۔ سب نے اُسی کی طرف رجوع کی مگر مختلف طور سے۔ اسی سے مذاہب مختلف ہوگئے، اور اطاعت کے طریقے مختلف طور پر نکالے گئے۔ پس احتیاج روحانی کے لیے انسان کو اطاعت خدا کی ضرور ہوگئی اور وہ اطاعت جمیع اطاعتوں سے بڑھ کر ٹھہری، کیوں کہ باعث ایسی اطاعت کا ایسا ہی امرِ عظیم شوق آمیز بلکہ عشق انگیز ہوا جس کے پورے ہونے میں جتنا شوق ذوق بڑھتا جائے اور بھی مطلب کی قربت ہوتی جائے۔ اس لیے شوق و ذوق کی افزائش نے درجہ بدرجہ انسان کو صوفیت تک پہنچایا یعنی انسان اپنے انجاح مطالب کے خیال میں اس قدر

مستغرق ہوا کہ اُس نے حاجت مند اور حاجت روا کو ایک ہی سمجھ لیا اور عاشق و معشوق کو ایک ہی قرار دیا اور کمال شوق کی انتہا کر دی :

دردکا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس سبب سے انسان رجوع کرتا ہے خدا کی طرف ساتھ اخلاص اور خواہش تمام کے۔ اور اس سے چاہتا ہے اپنے مقصود کو جیسے عاشق معشوق سے۔ اور الحاح و زاری میں تامل و شرم نہیں کرتا جیسے وصل کے لیے محب محبوب سے۔ پس جب اطاعت واسطے حصول لذات روحانی کے ٹھہری اور مطاع خدا ہوا اور مطیع بندے ٹھہرے تو عشق و محبت کا وجود قائم ہوا۔ اور اُس اطاعت اور عبادت میں بیانِ ذوق و شوق بھی جو بڑھتے بڑھتے عشقیہ تک پہنچتے ہیں، ضرور ہو گیا۔ اور اُس کو اہل اللہ اور عبادت کرنے والوں نے سچائی سے اپنے معبودِ حقیقی کے لیے بذریعہ دُعا و مناجات کے ظاہر کیا۔ پس دُعا اور مناجات شاعری سے خالی نہیں بلکہ عین سچی شاعری ہے۔

یہ درجہ تو اہل اللہ کو ملا تھا۔ دوسرے درجے میں حکما نے اپنے مطالب کے لیے قدم رکھا اور حقایق اشیا اور کیفیات [ص ۳۰] رُوحانی جو بذریعہ رجوع طرف خدا کے حاصل ہُوئے، اُس کا بیان کرنا شروع کیا۔ یہ بھی سچی شاعری ہوئی۔ تیسرے درجے میں اہلِ دیں سالک راہِ یقیں :

وحدہٗ لا شریک لہ گویاں

چلے۔ یہ بھی سچی شاعری ہے۔ چوتھے درجے میں اہلِ دنیا مال کے طالب، اولاد کے بُھوکے، ہمت میں پست، نیت میں خراب، خدا کی طرف رجوع ہوئے۔ اُس حکم نے مصلحتِ دنیاوی کے سبب سے اولاد بھی دی اور :

دولت نہ دہد خدائے کس را بغلط

دولت بھی بعضوں کو بخشی اور اُن کا مقصد تو اسی قدر دنیاوی جلوے کا تھا۔ خدا کی طرف سے منہ موڑا اور اولاد اور مال میں لذت جو ملی انھیں کے عشق میں غرق رہنے لگے۔ چنانچہ بہتوں نے اولاد

یا مال کے لیے اپنی جان دے دی ہے۔ مگر اسی فرقے میں جو اوّل درجے کے لوگ ہیں وہ مائل بہ علو جو ہوئے انھوں نے اہل اللہ کے کلام میں لذت جو پائی، آپ بھی مقلد ہوئے مگر تاثیر اس کی ہاتھ نہ آئی۔ لامحالہ مشق کی ٹھہرائی۔ اور ایک طریقہ غزل کا نکلا جس میں سائل اور مجیب شاعر آپ ہی ہوا۔ اور دُنیا کے عادات اور واقعات کی مشق کرنے لگا کہ بیان میں تاثیر پیدا ہو۔ اور اُن میں بعض صوفی خیال بھی ہوئے تو اُن کا مقصود اِس مشق سے پہنچنا درجۂ صوفیت تک ہوا اور جو اس کے مزے کو نہ جانتے تھے نقلیں کرنے لگے۔

آخر رذیل طبعوں اور پستی پسندوں نے انسان ہی کا عشق کرنا شروع کیا اور اس کے بیان میں دادِ شاعری دینے لگے۔ مگر جن کو واقعی انسان کا عشق ہوا تو اُن کے کلام میں لذّت زیادہ ہوئی۔ اور جو فقط نقال اور مقلد ہوئے تو فقط لباس ہی لباس نظر آیا۔ یہاں تک خیر تھی۔ آگے بڑھے تو ہزلیات میں قدم مارا اور تمسخر اور مضحکہ ہر قسم کا بھرنا شروع کیا۔ اور جو لوگ تاثیر کے کہنے والے تھے، انھوں نے اس فن کو چھوڑ دیا۔ بے تاثیری بہت ہو گئی اور لذت اور تاثیر اور حقیقت جاتی رہی۔

پس ایشیا میں شعر عاشقانہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی جو میں نے بہت [ص ۴۷] مختصر طور سے بیان کی ہے۔ اگر مشرح بیان ہو تو ایک دفتر ہو جائے۔ اور چونکہ انسان عبادت کے لیے پیدا ہوا ہے اور بسبب احتیاج روحانی کے انسان کو عبادت کی طرف ساتھ اس شوق ذوق کے جو کہ عشق کی راہ دکھاتے ہیں رجوع ہونا ضرور ہوا۔ اور پہلے وجود انسان کا ایشیا ہی میں پایا جاتا ہے اور پہلی آبادی دنیا کی ایشیا ہی ہے تو ایشیا میں عشق آمیز شاعری ضرور ہی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد دنیا جو آباد ہوئی اور یورپ قائم ہوا تو قاعدہ ہے کہ سابق سے لاحق کو اصلاح کرنے کا موقع اچھی طرح ملتا ہے۔ یورپ میں جب ایشیا کا فیض پہنچا تو انھوں نے مضامین عشقیہ کو ناپسند فرما کر فقط حقایق اور واقعات کو بیان کرنا منظور کیا اور اس کا انضباط جو ہو گیا تو سب اُسی طرح کہنے لگے۔ اب ان کی جبلّت ہو گئی جیسے ایشیائی شعرا کی جبلّت میں عشقیہ مضامین ہیں۔

چنانچہ ایشیا والوں میں سے ہندوستان کے شعرا یعنی کبت اور دوہرا کہنے والوں نے عشق عورت کا مرد کے ساتھ رکھا ہے۔ اور فارس کے شعرا نے عشق مرد کا مرد سے۔ اور عرب کے

شعرا نے عشق مرد کا عورت سے۔ مگر اردو میں تقلید فارس کی ہوتی ہے۔ پس یہ عشق آمیز شاعری یہاں کی ان وجہوں سے ہے کہ ہند میں عورت اپنے [شوہر] کو بسبب اس کے کہ بعد مرنے شوہر کے عورت کو دوسرے نکاح کا حکم نہیں، جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ اور اپنے عیش و عشرت کی کائنات شوہر کو سمجھتی ہے۔ اس لیے عورت کا عشق مرد کے ساتھ برتا گیا۔ اور فارس میں اولاد کی محبت کے خیال نے امرد کو مطبوع طبع کر دیا۔ آخر اصلی مقصد محبتِ اولاد کا تو چھپ رہا، اب فقط امرد پرستی رہ گئی۔ یہ وجہ ہے جو وہاں کی شاعری میں مرد سے مرد کا عشق ہوتا ہے۔

اور عرب میں بہ سبب جبلت انسانی کے مرد کا عشق عورت کے ساتھ ہے کہ باعث خانہ آبادی اور انتظام خانہ اور اولاد اور بقائے نسل اور راحتِ جان و دل ہے۔ تو اس تصریح سے [ص ۵،] معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب تقلید ہے اصلی شعرا کی جو علما اور حکما اور اہل اللہ ہیں کہ ان میں معشوق اصلی مخاطب کرنے کے لیے موجود ہے مگر عوام اہل دنیا نے ان کی تقلید کی۔ بعض نے اپنے مطبوعہ کو معشوق قرار دیا اور بعض نے وہمی معشوق قائم کیا۔ اور سب کا نام صنم، دل ربا، دل ستاں وغیرہ رکھ کر خیالات محبت اور رغبت کے ساتھ مضامین ہجر و وصال لکھے۔ اور جتنے گوشے اور محل اس میں پائے باندھنے شروع کیے۔ اور جس نے اس میں سچا گوشہ اور سچا محل پا لیا اُس کی تعریف ہوئی اور کچھ اس میں تاثیر بھی آئی۔ اور جس نے فقط لفظوں سے کام لیا اور معنی کی حقیقت کی طرف رجوع نہ کی، اس نے سوائے قافیہ پیمائی کے کچھ نہ کیا۔

[اس کے بعد ص ۵، ۶، پر "میں نے غزل گو شعرا کے لیے ایک میزان درست کی ہے ....." سے لے کر "مگر مجھے کوئی ان کا شعر یاد نہیں" تک کی وہی عبارت ہے جو "عود ہندی" میں چودھری عبدالغفور سرور کے نام کے ایک خط میں درج ہے اور جس کا حوالہ زیر نظر مقالے کے تیسرے باب میں آ چکا ہے]

[ص ۶،] یہ کیفیت ایشیا کی شاعریِ عشقیہ کی ہے۔

شیکسپیئر نے کہا کہ اگر ہمارے یورپ کی طرح لفظوں کے خوبصورت بنانے کی

ترکیب جن کے ملانے سے ایک مضمون دروغ پیدا ہو ترک کر دی جاتی تو سوائے اصلی حقیقت کے دوسرا بیان ایشیا میں بھی نہ ہوتا۔

غالب نے فرمایا، کیا یورپ میں لفظوں کی خوبصورتی نہیں۔

شیکسپیر: ہاں ہے مگر اتنی ضروری نہیں۔ تاثیر در لفظوں کی ضرورت وہاں بہت ہے جس سے بیان کی صورت دکھائی دے۔ آپ کے یہاں اس کے قواعد کیا ہیں؟

غالب نے کہا کہ یہ تو کلیہ ہے کہ جمیع علوم و فنون میں دخل رکھنے والے کو اصلی شاعر کہتے ہیں، اور اس لیے حکیموں پر شاعری کا لقب زیبا ہے۔ اب جو اُن سے نیچے درجے کے ہیں وہ مقلدین ٹھہرے۔ پس مقلد اپنی اپنی معلومات کے مطابق منصب پا سکتا ہے مگر مجمل طور کی شاعری کے لیے صرف و نحو وغیرہ ضروری علوم کے سوا خاص پانچ علم مخصوص شاعری ہیں۔ اوّل معانی، دوم بیان، سوم [ص ، ،] بدیع، اور اگر نظم کرنا ہو تو عروض و قافیہ۔ اور ضوابط شعر کہنے کے جو مجمل طور سے بیان کیے جاتے ہیں، وہ یہ ہے [ہیں] ۔

ایشیائی شاعر ہونے کے قواعد مجمل

شاعری کرنے کو بہت سے آلے اور بہت سے مقام ہیں، جب تک وہ حاصل نہ ہوں کسی کے لیے شاعری [شاعر؟] کا لقب زیبا نہیں، اور کسی کا شاعری میں نام نکل نہیں سکتا۔ اور خود شاعر کا کہنا اعتماد کے قابل نہیں مگر تجربہ کار اور اہل بینش اس فن کے جس کی شاعری کو مانیں۔ پس جس کو دعویٰ شاعری کا ہو پہلے ان باتوں میں جو مجملاً بیان ہوتی ہیں، ملکہ اور دخل حاصل کرے تو شاعری کا نام لے۔

آلۂ شعریہ ہیں کہ کلمات صحیح اور الفاظ خوشگوار اور عبارت بلیغ اور معانی لطیف کو جب ہاتھ میں لائے اور ان چاروں کو نثر کے سلسلے میں داخل کرے۔ اور نظم کہنا ہو تو اوزانِ مطبوع کے قالب میں ڈھلائے۔ پھر دیکھ لے کہ سننے والوں کو خوشی اور کیسی لذت حاصل ہوتی ہے۔ لوگ اچھا شعر اسی کو کہیں گے۔ اور جب تک ان آلات میں کاملیت نہ ہوگی شاعر کو تکمیل کا درجہ ہرگز حاصل نہ ہوگا۔

مقامات شعریہ ہیں کہ جس زبان میں نثر یا نظم کہنا ہو اُس کے لغت مفردات پر واقفیت ہونی چاہیے اور اس کی صحیح اور غیر صحیح ہر قسم کی ترکیبوں پر اطلاع بلکہ اُس کو یاد ہونا چاہیے۔ اور شاعروں کے مذہب جو بنانے شعر میں واقع ہوئے ہیں اور نظم کے طریق جو نکالے گئے ہیں، اور طریق اُن کے تعریف کرنے اور صفات کرنے اور درجے جاننے اور خطاب کرنے اور تعریف کرنے کی وجہیں اور اُس کی تصریحیں اور تشبیہوں کے قوانین اور مطابق کرنے کے ضابطے اور استعارات اور مجازات کے فنون اور مصنوعاتِ کلامی کے سب اوصاف جاننے چاہییں۔ اور کچھ حکم اور امثال اور تاریخ اور احوال بادشاہانِ سابق اور حکمائے سلف سے بھی واقف رہنا چاہیے۔ اور الفاظِ بزرگ اور محکم کو سست اور ضعیف سے پہچان لینا چاہیے اور معانی لطیف کا ضعیف سے [ص ۸۷] فرق کرنا اور ہر شعر کے حُسن مطلع اور لطف مقطع سے مطّلع ہونا چاہیے تاکہ عروس ہر معانی کو خلعت عبارت لائق سے آراستہ کر کے مقام نظم میں بٹھا سکے۔ اور بے اصل اور جھوٹی تشبیہیں اور بے سند اور بے بنیاد اشارے اور مشکل کنائے اور ناخوش اور بُرے ابہامات اور متکرر تجنیسات اور غریب اوصاف اور بعید استعارے اور نادرست مجازات اور نامطبوع تکلّفات سے بچنا لازم ہے۔

اور چاہیے کہ ہر مقام میں مقدار حاجت سے تفریط کی طرف نکل نہ جائے اور جو امر ضروری ہے اس کو نہ گھٹائے اور جو بیکار ہے اس میں خوض نہ کرے۔ اور جب نظم کا قصد کرے تو مختصر علم عروض و قوافی پڑھ لے کہ اوزان خوش اور ناخوش اُس کو معلوم ہوں اور جائز ناجائز پر اطلاع ہو۔ اور ابیات صحیح کو سقیم سے فرق کرے۔ یعنی وزنِ ابیات اور بحور قدیم اور جدید پر مطّلع ہو اور قوافی اصل اور معمول اور شائیگاں میں تمیز پیدا ہو۔ جب یہ سب باتیں آجائیں گی تو جو کچھ کہے گا صحیح اور مقبول ہو کر نظم اور قافیہ اور عذوبت الفاظ اور لطافت معنی میں درست ہوگا۔

بعد اس کے استادان سابق جو اچھے اور مستند ہو گئے ہیں، اُن کے سرمائے یعنی کلام اور دیوان کو پیدا کرے اور ہر صنف کے شعر چُن چُن کر یاد رکھے کہ اس کے حفظ سے مہارت اور عادت ہوگی۔ اور سب سے زیادہ دیوانوں کی سیر کیا کرے اور اجناس شعر کا ذکر کیا کرے اور جو کچھ

دقیقے اُس کے ہیں، اُس سے واقف ہو کہ اُستادوں کے مطالب اور معانی اور طریقے اور طرزیں اُس کے دل میں جاگزیں ہوں اور وہ الفاظ ذہن میں جگہ کریں اور اُن کی عبارت میں زبان کو ایک ملکہ ہو جائے، اور وہ سب مادہ شاعر کی طبیعت کو حاصل ہو جائے۔

پس جس کی طینت میں قابلیت اُس کے حاصل کرنے کی اور جس کی جبلت میں اُس فن کی تعلیم کی قوت ہوگی، اُس کے اشعار سے فائدے حاصل ہوں گے اور اُس کو اشعار سے فائدہ ملے گا، اور اُس کا نتیجہ سرور ہوگا اور شعر اُس کے [ص ۹۰] مثل چشمہ ہائے زلال کے ہوں گے جو بڑے دریا اور گہری نہروں یعنی استادوں کے دیوانوں سے حاصل ہوئے ہیں۔ اور جب کسی نظم کو شروع کرے پہلے مضامین اور مطالب اُس کے ذہن اور دل میں موجود کرلے۔ پھر ایک وزن اوزانِ شعر سے موافق طبع کے خوش آیند نکالے اور قافیے ایسے چُنے جن سے دل کو تفریح اور بشاشت ہو اور وہ قافیے ورق پہ لکھے اور جو اُن سے سہل اور درست اور بولتے ہوئے ہوں، اختیار کرے۔ اور قافیہ شایگاں اور معمول کو اپنے کلام میں راہ نہ دے اور نظم ابیات میں جو سخن کا سیاق ہو اور جس میں معانی کی ترتیب ہو وہ طریقہ اختیار کرے۔ اور اگر ایک قافیہ بندھ گیا ہو تو پھر وہی قافیہ اُس سے اچھا بندھے تو اگر پہلا بندھا ہوا قافیہ کچھ لطف نہ رکھتا ہو تو اُس کو کاٹ کر نکال ڈالے اور اگر دونوں میں ایک ایک بات پائی جائے تو دونوں کو رہنے دے۔ اور غزل ہو یا قصیدہ جب شعر بہت ہو جائیں، دُوسری بار بغور و تامل پھر پڑھے اور دیکھے اور اُس کی درستی اور چُستی میں مبالغہ کرے اور قصیدے میں بہت سے بیت اس طرح ملائے رکھے کہ معانی بیگانے نہ ہو جائیں، کس واسطے کہ بہت ایسا ہوا ہے کہ اگر دو مصرع یا دو بیتیں معانی کے طریقے سے مناسب اور ایک نہیں ہوتیں تو اُن کے سبب سے شعر کی رونق جاتی رہتی ہے۔

اور قوافی میں بہتر یہ ہے کہ تعین اُس کا معنی پہ مقدم کیا جائے۔ یعنی پہلے قافیہ نکال لے، پھر معنی اس سے الحاق کرے۔ کیونکہ اگر مضمون نکالا تو اب قافیہ ڈھونڈ رہے ہیں، اور اگر ملا تو قافیہ سست ملا۔ اس سے بہتر ہے کہ پہلے قافیہ سوچے، اُس کے بعد قافیہ کے لگاؤ

سے جتنے مضمون پیشِ نظر ہوں، اُن میں سے ایک ایک کو باندھ لے۔ یا جتنے اچھے مضمون ہوں اُن کو موزوں کرلے۔ اور اگر بنائے شعر قافیہ پر نہ ہوگی اور مضمون کی بندش پہلے ہی کی جائے گی اور اُس کے بعد قافیہ دیکھا جائے گا تو مثل اس رباعی کے ہو جائے گا۔ رباعی:

سودائے تو تا در دلِ من ساخت مقر
غم ہائے [ص ۸۰] تو از تنم نہ بگذاشت اثر
واکنوں اندر دل آرزو ہیچم نیست
جز آرزوئے روئے تو اے زیبا خور

ظاہر ہے کہ "زیبا خور" کا قافیہ کتنا برا ہے اور اس کو دوسرے قافیے میں یوں بھی کہنا ناممکن تھا۔ رباعی:

سودائے تو تا در سرِ من ساخت قرار
غم ہائے تو از تنم بر آوردہ دمار
و اکنوں اندر دل آرزو ہیچم نیست
جز آرزوئے روئے تو اے زیبا یار

اگرچہ خوش گویوں کے نزدیک یہ بھی کچھ نہیں مگر "زیبا خور" سے اچھا ہے۔

اور اسی طرح الفاظ اور معانی بیت میں بھی چاہیے کہ اگر لفظ رکیک آ جائے، اس کو نکال دے اور اگر معنی میں قصور واقع ہو اُس کو بھی تمام کرے اور چاہیے کہ اسلوب کلام میں مثل نسبت تشبیب مدح ذم آفریں نفریں شکر شکایت قصہ حکایت سوال جواب عتاب استعتاب تمتع تواضع تفاخر تکاثر ذکر یاد رسوم صفتِ آسمان و نجوم صفتِ بہار انہار اثمار ازہار تشبیہ لیل و نہار شرحِ ریاح امطار اور اسپ اور سلاح اور حکایتِ جنگ اور مصاف وغیرہ میں طریقہ افاضل شعرا کا اختیار کرے۔ اور اشعار فضلا سے عدول نہ کرے، یعنی ان چیزوں کے بیانوں میں جو جو لطف اور جو جو طریقے استادوں نے مقرر کیے ہیں اور جاری رکھے ہیں، اُسی طرح خود بھی عمل

کرے۔ اور اگر ایک معنی سے طرف دوسرے معنی کے یا ایک فن سے دوسرے فن کی طرف نقل کرنا چاہے تو طریقۂ لطیف سے خروج کرے اور طرز مستحسن سے شروع کرے اور اس کو گریز اور تخلص کہتے ہیں۔

اور اصناف خلق سے ہر طبقے کے لائق حال تعریف کرے اور ہر معنی کو لفظ لائق اور لباس عبارت موافق میں ادا کرے، کیونکہ عبارت کی پوشاکیں بہت ہیں اور معانی کی صورتیں مختلف۔ جس طرح زنِ صاحبِ جمال بعضے لباس میں اچھی معلوم ہوتی ہیں، اُسی طرح ہر معنی کے لیے الفاظ بھی ہیں اور اسی میں موضوع اور مقبول پہچانا جاتا ہے۔ اور اس بات میں نظم و نثر دونوں ایک ہیں۔ اور واضح ہو [ص ۸۱] کہ لطف عبارت اور حُسنِ اشارت کا خیال رکھے کہ شعر میں ایسے واقعے اکثر ہوئے ہیں کہ ایک بیت سے دوستی جانی دشمنی سے بدل گئی ہے، اور ایک فقرے سے بادشاہ کا کمالِ تلطف قہر سے مبدّل ہوگیا ہے۔

یہ کہہ کر حضرت غالب نے کہا کہ یہ قواعد و ضوابط شعر کہنے کے مجمل ہیں۔ ایشیائی شاعری میں انھیں کا انضباط چاہیے۔ پھر شعرائے فرنگ کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا "اب آپ لوگ اسی طرح مجمل ضوابطِ شاعری یورپ کا بیان کیجیے تاکہ فرق معلوم ہو۔"

یورپ کی شاعری کے قواعد

مسٹر جانسن نے اٹھ کر بیان کیا کہ میں نے رسلس [RASSELAS] کے قصے میں املاک [IMLAC] شاعر کی سرگزشت لکھی ہے، اور اس میں قواعد شاعری کا بیان کچھ آگیا ہے، اس کو بیان کرتا ہوں۔ اُس سے معلوم ہو جائے گا۔

املاک نے رسلس سے بیان کیا کہ جس جس ملک میں میں گیا، یہی دیکھا کہ سب علموں سے زیادہ شاعری کی قدر ہے۔ اکثر مقامات میں شاعر کی لوگ اس قدر تعظیم و تکریم کرتے ہیں جیسے انسان فرشتوں کی۔ مگر مجھ کو ایک بات کے دیکھنے سے کمال تعجب ہوا کہ ہر ملک میں قدیم شاعر اخیر زمانے کے شاعروں سے ہمیشہ بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے

علم بتدریج حاصل ہوتا ہے اور شاعری مثل ایک عطیہ کے دفعۃً مل جاتی ہے۔ یا یہ وجہ ہو کہ ہر قوم اور ہر ملک میں ابتداءً جو شعر تصنیف ہوئے، اور بسبب نویت کے مرغوب ہوئے اور اب تعظیماً اُس کی تعریف اور توصیف کی جاتی ہے۔ یا شاید یہ وجہ ہو کہ شعرا اشیائے قدرتی اور جذباتِ انسانی کو موزوں کرتے ہیں اور یہ چیزیں ہر زمانے میں یکساں نہیں۔ اس لیے ممکن ہے کہ اگلے زمانے کے شاعروں نے جس قدر کہ حیرت خیز اور دلچسپ مضامین ہوں منتخب کر کے بیان کر دیے۔ اور زمانۂ حال کے [ص ۸۲] شاعروں کے لیے کچھ نہ چھوڑا، جز اس کے کہ بندھے ہوئے واقعات کو دوبارہ نظم کریں یا انھیں صورتوں کو نیا لباس پہنا کر پیش کریں۔

خیر اس کی جو کچھ وجہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ شعرائے متقدمین اصلی اور قدرتی چیزوں پر قادر ہیں، اور متاخرین علم و ہنر کے حاصلات پر حاوی۔ اگلوں کے کلام میں قوتِ ایجاد اور مضمون آوری بہت ہے۔ اور حال کے شاعروں میں الفاظ کی خُوبی اور بندش کی نفاست زیادہ ہے۔ مجھے بھی تمنا یہی ہُوئی کہ میں اپنے نام کو اس برتر فرقے میں داخل کروں۔ میں نے عرب اور فارس کے بڑے بڑے نامی شاعروں کے کلام کو دیکھنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ ذخیرہ شاعری کا جو مسجد کعبہ پر چسپاں رہا کرتا ہے، مجھے بر زبان ہو گیا۔

مگر مجھے فوراً معلوم ہوا کہ صرف تقلید کرنے سے کمال نہیں حاصل ہو سکتا ہے۔ اس خواہش نے کہ میں اِس فن میں کمال حاصل کروں، مجھے مخاطب کیا کہ میں اشیائے قدرتی کو دیکھوں۔ انسان کی حیات کا مشاہدہ کروں۔ ہمارے مضامین قدرتی چیزوں سے علاقہ رکھیں گے اور ہمارے سننے والے انسان ہوں گے۔ اس لیے میرے خیال میں یہ آیا کہ میں ہرگز اُس شے کو اچھی طرح بیان نہیں کر سکتا ہُوں جس کو مَیں نے خود کبھی نہ دیکھا ہو، اور میں ہرگز کسی شخص کے دل میں خوشی یا خوف، کسی قسم کا اثر پیدا نہیں کر سکتا جب تک کہ میں اس کی رائے اُس کی خواہشیں اور اس کی طبیعت کے میلان

---

۵ حاشیہ از صفیر: مراد سبعۂ معلقہ امراء القیس

سے واقف نہ ہوں۔

شاعر بننے کا میں نے مصمم قصد کیا اور سب چیزوں کو نئی غرض سے دیکھنا شروع کیا۔ اپنی معلومات کے میدان کو نہایت وسیع اور دراز پایا۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جو فروگذاشت کرنے کے قابل ہو۔ تشبیہ اور مثال کی تلاش میں صحرا اور پہاڑوں پر دشت نوردی اختیار کی۔ جنگل کے درخت اور وادی کے پھولوں کو دیکھ کر ہر ایک کی تصویر خیالی اپنے ذہن میں اتاری۔ چٹان کے نشیب و فراز [ص ۸۳] اور بادشاہی عمارتوں کے کلس دونوں کو یکساں احتیاط کی نظر سے دیکھنے لگا۔ کبھی نہر اور چشموں کی پیچ در پیچ راہوں کو قطع کرتا اور کبھی ابرِ زمستان کے مختلف رنگوں کا انتظار کھینچتا۔

شاعری کے لیے کوئی چیز بیکار نہیں ہے۔ جتنی چیزیں حسین ہیں، جتنی چیزیں کہ خوفناک ہیں، سب کو اُسی ذخیرۂ فکر میں موجود رہنا چاہیے۔ اور اُسے جاننا چاہیے اُن چیزوں کو جو نہایت عظیم ہوں۔ اور بھی اُن چیزوں کو جو نہایت نازک ہوں، اور حقیقت میں گلشن کے ریاحین، صحرا کے جانوروں، کان کی معدنیات، شفق کے رنگین جلووں کا پورا جذبہ شاعر کے خیال میں رہنا چاہیے۔ کیوں کہ مذہبی اور اخلاقی مسئلے کے اثبات اور تزئین کے لیے ہر ایک چیز کا جاننا ضرور ہے۔

ظاہر ہے کہ شاعر کی معلومات جس قدر زاید ہوگی، اُسی قدر قوّت ہوگی کہ اپنے کلام کو نئے نئے مضامین سے آراستہ کرے۔ اور مثال دے دے کر کنایۃً غیر کے مشابہات میں موزوں دکھلا کر سامعین کو محظوظ اور خوش کرے۔ میں نے ہر چیز کو احتیاط کی نظر سے دیکھنا شروع کیا، اور جس جس ملک میں گیا، اُس نے کچھ نہ کچھ خراج ہماری شاعرانہ قوت کے لیے پیش کیا۔ یعنی ہماری معلومات کو زیادتی ہوتی گئی۔ مگر شاعر کا یہ کام نہیں کہ وُہ ہر فرد کو دیکھے بلکہ اس کو اقسام اور اجناس کا دیکھنا چاہیے۔ سب چیزوں کی عام خاصیت اور ممتاز صورتوں کو دریافت کرنا چاہیے۔ شاعری کے لیے یہ ضرور نہیں کہ لالہ اور یاسمن کی تحریر اور خطوں کو شمار کرے یا جنگل کے سبزے کے مختلف عکس کو یاد کرے۔

شاعر کو اسی قدر چاہیے کہ جس چیز کو نظم کرے، اُس کی اعظم اور ممتاز کیفیتوں کو اس طرح دکھلائے کہ سُننے والے کے سامنے اصل چیز کی تصویر پھر جائے۔ غیر ممتاز اور خفیف علامتوں کو

جس کو کسی نے خیال کیا ہو، متروک کرنا چاہیے۔ اور اس کی جگہ پر بدیہی کیفیتیں جو ہر دیکھنے والے کو ⁽٥⁾ اعم اس سے کہ اُس نے احتیاط کی نظر سے دیکھا ہو [ص ۸۴] یا نہیں) معلوم ہوں، موزوں کرنا چاہیے۔

اشیائے قدرتی کا تو جاننا شاعر کے نصف تحصیل میں داخل ہے۔ علاوہ اس کے ہر مختلف طریق زندگانی کا جاننا اُس کے لیے ضرور ہے۔ شاعر کا منصب یہ ہے کہ وُہ نہایت احتیاط کے ساتھ دریافت کرے کہ ہر حالت میں کس قدر خوشی اور کس قدر رنج ہے۔ اور یہ کہ ہر ایک کی خواہش اور جذبات انسانی کا دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اُس کو بغور دیکھنا چاہیے کہ انسان کے مزاج میں طفلی کی شگفتگی اور بے فکری کے زمانے سے لے کر پیری اور ناتوانی کی یاس اور ناامیدی کے وقت تک کیا کیا تفرقہ ہوتا ہے۔ اور مختلف آب و ہوا اور رسم و رواج کا انسان کے دل پر کیا اثر ہوتا ہے۔

اور لازم ہے کہ شاعر آپ کو اپنے زمانے یا ملک کے تعصب یا پابندیِ رواجِ غلط سے بری رکھے۔ اور درست اور غیر درست سے، اُن کی منتخب اور غیر تبدّل حالت کو خیال کرے۔ بالفعل کی آئینوں اور تحریروں پر ملتفت نہ ہو بلکہ اصل مطلبوں پہ نظر کرے جو ہمیشہ ایک سے ہوں۔ اسی جہت سے چاہیے کہ وہ بتدریج اپنے نام کی ترقی سے آسودہ ہو اور زمانے کی تعریف کو سبک سمجھے۔ اور اپنے نام کے دعوے کو آیندہ کے انصاف پر حوالے کر کے آپ کو مثل مترجم خلقت اور شارع اور استادِ انسان کے تصور کرے۔ اور آپ کو آیندہ نسل کے خیالات و طریق و دستور کا تعلیم کرنے والا جانے۔ وقت اور مقام کا پابند اور متقید نہ رہے۔

شاعر کی محنت و تلاش ہنوز آخر نہیں ہوئی۔ حتی الامکان مختلف زبانیں اور بہت سے علموں کو جانے۔ اُس کی عبارت قابل اُس کے خیالوں اور قابلیت کے ہو اور متواتر مشق اور مزاولتِ روزمرّہ سے نزاکتِ کلام آراستگی پائے۔ اور مضمون برجستہ اور موزوں ظہور میں آوے۔

جب دونوں مقام یعنی ایشیا اور یورپ کی شاعری کے قواعد مجملاً بیان ہو چکے تو حضرت غالب پھر کھڑے ہوئے اور بولے کہ بادی النظر میں اس بیان سے یہ معلوم ہوا [ص ۸۵] کہ ایشیا کی شاعری میں الفاظ کی خوب صورتی سے بحث ہے، اور مضامین کی صورتیں جو اساتذہ نے

---

٥ قوسین اصل کے مطابق ہیں۔

نکالی ہیں، اُس کی تقلید سے کام ہے۔ اور یورپ کے قواعد سے مضمون کا لگاؤ معلوم ہوا کہ اس میں بدیہی اور قدرتی چیزوں کی کیفیات جو اپنی نظر سے گزری ہوں، اُس کا جلوہ بجنسہٖ دکھانا منظور ہے۔ مگر میرے نزدیک الفاظ کا منقح اور درست ہونا پہلی ضروریات سے ہے تاکہ بدیہیات کی کیفیت بیان ہو سکے اور سامع کی نظر میں اُس کا جلوہ بجنسہٖ نظر آوے۔

مگر اس میں شک نہیں کہ شاعر کو موافق قواعد یورپ کے خود ناظر اور واقف کار ہونا چاہیے۔ مضامین کی تقلید حقیقتاً ناجائز اور اترا ہوا پیرہن اور ملی ہوئی مہندی ہے۔ اور بیشک بقول املاک کے اگلے شعرا کی تعظیم جو کی جاتی ہے، اسی جہت سے ہے کہ وُہ اپنی معلومات کے ذریعے سے مضمون نکالتے تھے۔ اور اب کے شعرا اُسی ڈھرّے پر چلے جاتے ہیں جو پہلے شاعر نے نکالے ہیں جیسے کتاں کا پرتو ماہ میں پھٹ جانا اور زمرد سے افعی کا اندھا ہو جانا۔ آصف الدولہ نے افعی تلاش کر کے منگوایا اور قطعات زمرد اُس کے محاذی چشم رکھے، کچھ اثر ظاہر نہ ہُوا۔ ایران اور روم اور فرنگ سے انواع کپڑے منگائے، چاندنی میں پھیلائے۔ کوئی مسکا بھی نہیں۔[٭] مگر شعرا میں اسی کی تقلید ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ مضمون پیدا کرنے کا طریقہ یورپ کی شاعری میں ہے اور اس مضمون کے ادا کرنے کا طریقہ ایشیا کی شاعری میں۔ اب ان دونوں کو ملا کر غور کیا جائے کہ تفاوت کس قدر ہے اور ایشیائی مضامین میں کس قدر غلطی اور یورپ کی ادابندی میں کتنی تفاوت ہے۔

شیکسپیئر نے کہا: بعد غور جو کچھ تفاوت نکلے، وُہ دیکھا جائے گا۔ مگر بادی النظر میں ایشیائی شاعری میں دو عیب کُھلے کُھلے ہیں جن کا نکالنا ضروریات سے ہے۔ ایک فحش کا استعمال کہ مہذبین بھی اس سے خالی نہیں۔ جیسے حضرت سعدی کی گلستان کہ تہذیب الاخلاق کی کتاب ہے اس میں بھی فحش کا دخل ہے۔ اب اور کتابوں کو کون [ص ۸۶] پوچھتا ہے۔ یورپ میں اس کی قید ہے

٭ "جیسے کتاں ..." سے لے کر یہاں تک کی عبارت غالب کے ایک خط بنام صاحب عالم مارہروی سے لی گئی ہے۔ (عود ہندی، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۸۷)

اور شاعر کبھی ایسے کلمات اپنی تصنیف میں لا نہیں سکتا بلکہ اُس کے خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔ دوسرے ہجویات کہ آپس میں بے کار بے سبب جھوٹ جھوٹ خیالات باندھ کر ایک دُوسرے کی ہجو کرنا ہے۔ اور فارسی کے اِس فقرے کو کہ "شاعرے کہ ہجو گفتن نداند بازلیست کہ چنگال ندارد" شاعری کی دلیل سمجھ کر ہر ایک اپنے خیالات کو ایسی باتوں سے تیرہ و تار کرتا ہے۔

فارسی شعرا میں جو کچھ ہجویں آپس میں ہوئیں وُہ مشہور عالم ہیں۔ اردو کے شعرا میں جو کچھ لکھا پڑھا گیا، روشن ہے۔ میر و مرزا کے آخر زمانے بلکہ انشا اور مصحفی تک اس کا التزام اردو میں رہا۔ ناسخ نے اپنے وقت میں اِس کو اٹھا دیا بلکہ اُن کی ہجویں جو مصحفی وغیرہ یا آتش نے کیں:

بہ بزم وُہ ہے کہ لاخیر کا مقام نہیں
ہمارے گنجفہ میں بازیٔ غلام نہیں

اُس کا جواب مہذبانہ اپنے شاگرد وزیر کو کہہ کر دے دیا، اور اِس راہ کو بند کر دیا۔ اور جواب یہ ہے:

جو خاص بندے ہیں وہ بندۂ عوام نہیں
ہزار بار جو یوسف بکے غلام نہیں

ناسخ کے خاندان میں تو ہجو گوئی کا رواج بالکل اُٹھ گیا۔ اور ان کی دیکھا دیکھی اور خاندان والوں نے بھی کچھ کچھ اُن کی تقلید کی مگر بہت تھوڑی۔ اور مضامین فخریہ کا استعمال اُس کی جگہ ہونے لگا۔ یہ ایک بات ہے لیکن بعض نا عاقبت اندیش پھر جادۂ تہذیب سے باہر ہو چلے ہیں۔ اور چونکہ اِس وقت میں محض تقلیدی شاعری رہ گئی ہے، علم و فضل سے تو بہرہ نہیں، اساتذہ کے کلام سے وصل و ہجر و شراب و کباب، موت و حیات کی کیفیت معلوم کر کے بے محنت اوروں کے مضامین اِس میں ملا کر، اِس کی اُس میں پہنا کر دو چار شعر موزوں کرنے لگے۔ اور بسبب ثروتِ عارضی کے کہ بیک دم جا سکتی ہے، چار خوشامد خوروں کی واہ واہ سبحان اللہ پر مغرور ہو کر اپنی بساط بڑھانے کی نظر سے پچاس ساٹھ نا آشنائے شاعری، لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل، محرم کے سپاہی، رمضان کے نمازی، [ص ۸۷] ہولی کے گویتے، مشاعرے کے شاعر کو ساتھ لے کر مشاعروں میں جھُوٹ مُوٹ واہ واہ کا غل مچوا کر استاد بننا

چاہتے ہیں۔

اور جن کی بدولت اِس راہ کو دیکھا، اُن کے نام کے مٹانے کی فکر میں کیا کیا کچھ فکریں نہیں ہو رہی ہیں۔ کوئی سچّی بات کو جھٹلانے کے لیے اہتمام کرتا ہے۔ کوئی اپنے ساتھ اوروں کو بھی ملاتا ہے۔ کوئی تمسخر کرکے مسخرا پن کرتا ہے۔ غرض خود غلط، انشا غلط، املا غلط۔ احسان فراموشی اور محسن کشی پہ کمر باندھی ہے۔ خدا کا خوف اور خلق اللہ کی شرم اگر جاتی رہے تو اتنا سمجھنا چاہیے کہ شاعر حکیم کے درجے میں ہے، اور حکیم کو انصاف دشمن اور حق فراموش نہ ہونا چاہیے۔

دیکھیے ہم یورپین کو کہ آج خدا کے فضل سے تمام عالم سے ذہن و ذکاوت، جاہ و دولت میں منتخب ہیں اور سابقین اگر ہم سے ملائے جائیں تو پاسنگ میں نہ آئیں، مگر اس پر بھی ہم شکر گزار اُن لوگوں کے ہیں جن سے ہم کو فیض پہنچا۔ ہم عرب کے ممنون ہیں اور مسلمانوں کے شکر گزار کہ اُن کے گھر سے ہم نے علم کی دولت پائی۔ گو اب ہم اُن سے بڑھ کر ہیں مگر اُس تعلیم پانے کو بھولتے نہیں۔ پس ہمارے خیالات شاعری کو اسی پر قیاس کر لینا چاہیے۔ اور ایسی ہی انصاف کی نظر ہم لوگوں میں ہر بات پر ہے۔ میں نے یہ تقریر بہت مختصر کی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ پھر کبھی مشرح اس کے نقص بیان کروں گا۔

حضرت غالب یہ سُن کر عرق عرق ہو گئے، اور بار بار میری طرف دیکھنے لگے کہ میں کچھ بولوں۔ مگر میں نے اتنا ہی کہا کہ صاحب جو کچھ فرماتے ہیں، سچ فرماتے ہیں۔

حضرت غالب نے جلسے کی طرف مخاطب ہو کر کہا: الحمد للہ کہ آج کا جلسہ بہت فوائد سے مملو تھا اور اچھے اچھے اساتذہ نے کرم فرمایا اور بہت سی باتیں اصلاح پذیر معلوم ہو گئیں۔ اب چونکہ طول ہو گیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ قواعد شاعری ایشیائی اور یورپی جو کچھ یہاں بیان ہوئے یا اور جو کچھ معلوم ہوں، سب صاحب ان کو پیشِ نظر رکھ کر ہر ایک [ص ۸۸] ان میں غور کرے اور حُسن و قبح نکالے اور وہ جلسۂ آیندہ میں پیش کیے جائیں اور پھر اصلاح کی صورت پیدا ہو۔ یہ کہہ کر جلسہ برخاست ہوا اور میں گویا طلسم میں تھا کہ باہر آ گیا اور آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ گیا.....

توضیح المقال فی شرحِ محشرستان خیال

صفیر کی کتاب "محشرستان خیال" کے جواب میں سردار مرزا آزاد نے مذکورہ عنوان سے ایک رسالہ لکھا۔ یہ "تنبیہ صفیر بلگرامی" کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ رسالہ مطبع صبح صادق عظیم آباد سے شائع ہوا۔ اس پر سالِ طباعت درج نہیں، تاہم یہ یقینی ہے کہ یہ رسالہ "محشرستان خیال" کی اشاعت (۱۲۹۹ھ) کے فوراً بعد شائع ہوا تھا۔

آزاد نے صفیر کا مضحکہ اڑانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور "محشرستانِ خیال" کے تمام ابواب پر حاشیہ آرائی کی ہے۔ آزاد نے خیالی مشاعرے اور جلسے کے سلسلے میں یہ پیرایہ اختیار کیا ہے کہ وُہ بھی وہاں موجود تھا۔ "توضیح المقال" میں غالب سے متعلق جو عبارتیں ملتی ہیں، وہ ذیل میں درج کی جا رہی ہیں۔ چونکہ یہ تمام عبارتیں "محشرستان خیال" کے جواب میں یا اُس کے حوالے سے لکھی گئی ہیں، اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ کون سی عبارت "محشرستان خیال" کے کس حصے کے جواب میں ہے نمبر شمار درج کیے گئے ہیں۔ گزشتہ باب میں "محشرستان خیال" کے اقتباسات میں بھی یہی نمبر شمار درج ہیں۔

ص ۱ پراگندگیِ عبارت اور ژولیدگیِ بیان سے قطع نظر مُردے کا زندہ کو بلانا خواب میں ہو یا خیال میں، خالی از تردد نہیں ہوتا۔ خدا کی بارگاہ میں توجہ کیجیے۔ فقرا اور مساکین کو کچھ خیرات دیجیے۔ (ص ۱۲)

ص ۲ ہمراہ مولوی صاحب کے آزاد نے بھی قصد جانے کا کیا۔ اُس جوان رعنا نے کہا "آپ کو نہیں بلایا ہے، آپ کیوں جاتے ہیں"۔ آزاد نے کہا "میں بھی ذرا حضرت غالب کی ملازمت حاصل

کروں گا۔ اگر تم کو عذر ہو تو میری اطلاع کرو کہ سردار مرزا آزاد تخلص بھی آرزومند قدم بوس (کذا) ہے"۔
وہ جوان گیا اور آیا اور کہا "اچھا چلیے"۔ الغرض ہمراہ مولوی صاحب کے آزاد بھی روانہ ہوا۔ (ص ۱۲)

۳ ـ آزاد بھی پہنچ کر مراسم آداب بجا لایا۔ غالب نے گلے سے لگایا اور پاس اپنے بٹھایا۔ (ص ۱۳)

۴ ـ یہ سن کے مولوی صفیر صاحب بہت روئے اور عرض کی کہ "حضور میں ہر چند محنت کرتا ہوں، مشق بھی برسوں کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو ابھی تک شعر کہنا نہیں آیا۔ کلام میرا مقبولِ انام نہ ہوا۔ ہر طرف سے اعتراض کی بوچھار ہے۔ شعر پڑھنا دشوار ہے۔ اب زندگی سے عاجز ہوں"۔
غالب نے فرمایا کہ "بھئی ہر چیز کے واسطے مناسبتِ طبیعت کی شرط ہے۔ تمھاری طبیعت کو مضامینِ ناخن بدل زن سے مناسبت نہیں ہے۔ رُوکھے پھیکے شعر کہتے ہو، پھر اس میں قبولیت کہاں"۔ (ص ۱۳)

۵ ـ مطلع صفیر:

تو آکے دمِ نزع جو آغوشش کشا ہو
دم نکلے تو بوئے گلِ صد چاک قبا ہو

یہ مطلع جو مولوی صفیر صاحب نے پڑھا، غالب نے سن کر فرمایا "بھئی اس کے مصرعِ آخر کی ترکیب اور بندش میں اس قدر تعقید اور ابہام ہے کہ شعر کا مطلب مفقود ہو کر بالکل مطلع مہمل معلوم ہوتا ہے"۔ آزاد نے عرض کی کہ "اس مطلع پر کمترین نے مصرعے لگائے ہیں۔ اجازت ہو تو عرض کرے"۔ فرمایا "ہاں میاں، کیا مصرعے ہیں"۔ آزاد نے عرض کی:

بوئے گلِ صد چاک کی ترکیب جو چا ہو　　اور لفظ قبا کا اُسے خلعت بھی ملا ہو
مطلب کا تو پھر بند نہ اد ہیں سے وا ہو　　تو آکے دمِ نزع جو آغوشش کشا ہو
دم نکلے تو بوئے گلِ صد چاک قبا ہو

یہ مصرعے سن کر حضرتِ غالب زیرِ لب مسکرائے اور فرمایا "ماشاءاللہ میاں تم نہایت ذکی ہو۔ کیا خوب مصرعے تم نے لگائے ہیں۔ اس مطلع کے واسطے ایسے ہی مصرعے مناسب تھے"۔ پھر مولوی صفیر صاحب

نے دُوسرا یہ مطلع پڑھا:

گھٹنے پہ بھی عاشق کا الم اور سوا ہو
ہو صبح شبِ ہجر کی تو روزِ جزا ہو

حضرت نے سُن کر فرمایا کہ "یہ مطلع بھی اسی طرح کا واک ہے"۔ آزاد نے عرض کی کہ "اس پہ بھی خاکسار کے مصرعے ہیں"۔ حکم ہوا، پڑھو۔ آزاد نے عرض کی:

گھٹنے کی جگہ کم کو اگر بولو تو کیا ہو — اور صبح شبِ ہجر سے کیوں اتنا خفا ہو
تم ڈر گئے تکلیفِ الم سے تو ہوا ہو — گھٹنے پہ بھی عاشق کا الم اور سوا ہو
ہو صبح شبِ ہجر کی تو روزِ جزا ہو

یہ سن کے غالب نے فرمایا "بہت ہی خوب مصرعے کہے ہیں۔ ماشاء اللہ"۔ پھر مولوی صاحب نے یہ مطلع پڑھا:

کیا عاشقِ ابرو کی دیت اس سے سوا ہو
تلوار بکف تو ہو کھڑا خون بہا ہو

حضرت غالب نے سُن کر بہت تعجب سے مولوی صفیر صاحب کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ "علاوہ پستی، مضمون اور سستی، ترکیب کے غلطیاں فاش بھی آپ سے ہو جاتی ہیں"۔ مولوی صفیر صاحب نے عرض کی: "حضور اصلاح سے مزین فرمائیں"۔ حضرت نے فرمایا کہ "میرے نورِ نظر آزاد نے ضرور اس پر مصرعے لگائے ہوں گے اور تم کو تمھاری غلطی پر متنبہ کیا ہوگا۔ ہاں میاں، اس مطلع کے مصرعے تو سناؤ"۔ آزاد نے عرض کیا:

تلوار بکف کس نے کہا ژرف نگاہو — شمشیر بکف کہتے ہیں سب تم نے سنا ہو
گر فارسی ہندی سے ملے یوں تو مزا ہو — کیا عاشقِ ابرو کی دیت اس سے سوا ہو
تلوار بکف تو ہو کھڑا خون بہا ہو

یہ مصرعے سُن کے غالب نے فرمایا کہ "ہاں یہ اصلاح ہے اور جائے استاد خالی اِسے کہتے ہیں"۔ یہ

سُن کے مولوی صفیر صاحب بہت ہی غضب میں آئے، اور غصّے میں آکر یہ شعر پڑھا :

روکے نگہِ عاشقِ بے تاب کے ناوک

ہاں ہاتھ میں جس کے سپرِ ناز و ادا ہو

غالب نے فرمایا کہ "معشوق کو آپ اپنے ناوک نگاہ کا ہدف بناتے ہیں۔ یہ مضمون معکوس مذموم ہے۔"

آزاد نے وہیں یہ مصرعے پڑھے :

معشوق کے اب ناز اٹھانے سے گیا تھک ‏ ‏ ‏ ‏ کیا عاشقِ صادق ہے ارے واہ رے کُتّھک

روکے نگہ عاشق بے تاب کے ناوک ‏ ‏ ‏ ‏ اب بچتا پھرتا ہے یہی کہہ کے تو اور کے

ہاں ہاتھ میں جس کے سپرِ ناز و ادا ہو

غالب زیرِ لب مسکرا کر خاموش رہے۔ مولوی صفیر صاحب نے کہا "حضور بھلا اِس شعر پر تو آزاد صاحب مصرعے لگائیں تو میں جانوں" :

ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں پسِ وصل وہ مجھ سے

اب تو ہے یقیں کوئی نہ ارمان رہا ہو

آزاد نے عرض کی "حضور کیا ہی عمدہ مصرعے اس پر خاکسار نے لگائے ہیں لیکن ادب مانع ہے، کیونکر عرض کروں" ارشاد ہوا کہ "میاں جیسا مضمون ویسے ہی مصرعے ہوں گے۔ ہم سمجھا کہ فحش مضمون اس شعر کا ہے ویسے ہی فحش مصرعے بھی ہوں گے۔ پھر تم اس میں معذور ہو" آزاد نے یُوں عرض کیا :

پہلے تو بہت روئے مگر پھر لگے ہنسنے ‏ ‏ ‏ ‏ میں بھی نہ رُکا جب کہ وہ لیٹے مرے آگے

ہنس ہنس کے یہ کہتے ہیں پسِ وصل وہ مجھ سے ‏ ‏ ‏ ‏ رومال سے پھر پونچھ کے اور ہاتھ کو دھو کے

اب تو ہے یقیں کوئی نہ ارمان رہا ہو

حضرت غالب نے فرمایا "مولوی صفیر صاحب آزاد کے مصرعوں کو آپ نے سنا، کیا خوب مصرعے لگائے ہیں۔ ہاں اور شعر پڑھیے۔"

مولوی صاحب نے فرمایا :

اب تو یہی سوجھی ہے کہ جب تک وہ یہاں آئیں
جاروب کشِ راہِ طلب دستِ دُعا ہو

غالب نے آزاد سے مخاطب ہوکر فرمایا "کیوں میاں اس میں کیا غلطی ہے۔ مصرعے تو پڑھو" آزاد نے عرض کیا:

سوجھی یہاں بے لطف ہے کیوں کر تمھیں سمجھائیں — باریکیاں لفظوں کی کہاں تک تمھیں بتلائیں
بے فائدہ بکتے ہو کبھی آئیں کبھی بائیں — اب تو یہی سوجھی ہے کہ جب تک وہ یہاں آئیں
جاروب کشِ راہ طلب دست دعا ہو

غالب نے فرمایا "جزاک اللہ، ہاں مولوی صاحب اور شعر پڑھیے"۔ مولوی صاحب کی تو یہ حالت ہُوئی کہ غیظ و غضب، ندامت اور خجالت سے عرق عرق ہو گئے۔ پڑھیں تو مشکل، نہ پڑھیں تو مشکل۔ کیا کریں۔ آخر مجبور پڑھتے ہی بن آئی تو سوچ سمجھ کر یہ شعر پڑھا:

کچھ کم نہیں تاثیر میں الفت کا فسانا
تم حُسن کے شہرے سے عبث محوِ ادا ہو

غالب نے فرمایا "مولوی صفیر صاحب بُرا نہ مانو تو کہوں یہ شعر قطع نظر دولخت ہونے کے محض مہمل اور مجہول المعنیٰ ہے۔ ایسے شعر کیوں کہتے ہو" آزاد نے مصرعے عرض کیے:

کیا ربط ہے مضموں میں سمجھتا ہے زمانا — گھر بیٹھے ہیں دن رات کہیں آنا نہ جانا
اور محو ادا کا تو ہے کیا خوب ترانا — کچھ کم نہیں تاثیر میں الفت کا فسانا
تم حُسن کے شہرے سے عبث محوِ ادا ہو

غالب نے فرمایا "یہ مصرعے سُنیے، شاید اب شعر نہ پڑھیے گا"۔ مگر مولوی صاحب کب کسی کی سنتے ہیں۔ کہنے لگے "یہ شعر تو سُنیے":

"تکلیف جراحت سے ملی ہے مجھے راحت
گلشن کا دریچہ کبھی ایسا نہ کھلا ہو

آزاد نے فوراً مصرع لگا کے یوں پڑھے:

"ایسا نہ کھلا ہو" نے بڑھا دی مری وحشت — مضموں ہے کہ آفت ہے بلا ہے کہ قیامت

ایسی تو ردیف اس پہ پڑی ہے یہ مصیبت — "تکلیف جراحت سے ملی ہے مجھے راحت

گلشن کا دریچہ کبھی ایسا نہ کھلا ہو

یہ سُن کے مولوی صاحب بہت ہی غضب میں آئے۔ اور آزاد سے کہنے لگے "آپ کیوں بیچ میں بولتے ہیں"۔ آزاد نے عرض کی کہ "میں تو آپ کے مضمون مغلق کی شرح کرتا ہوں یا یُوں سمجھیے کہ آپ کے عیوب شعر پہ مصرع لگا کر آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہے تو میں اب نہ بولوں گا۔" یہ کہہ کر آزاد خاموش ہو گیا۔ کہیں شیخ محمد ابراہیم ذوق بھی اسی جگہ بیٹھے سُن رہے تھے۔ بولے "جناب آزاد صاحب خدا کے واسطے آپ چُپ نہ رہیے گا۔ آپ کے مصرعوں میں عجب مزا ہے۔ ہاں مولوی صفیر صاحب، شعر اسی غزل کا پڑھیے"۔ مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا:

پھر جائے کہیں الٹی چھری شرم و حیا پر

حق میرا ترے نشے کے ڈوروں سے ادا ہوا

غالب نے اس شعر کو سُن کے مُنہ پھیر لیا، اور کہا "بھئی ایسے شعر کہنے سے تم اگر نہ کہا کرو تو بہتر ہے۔ کیوں شعرا کی آبرو کھوتے ہو اور شاعری کے نام کو ڈبوتے ہو"۔ ذوق نے کہا "ہاں جناب آزاد صاحب ہم آپ کے مصرعے سننے کے مشتاق ہیں۔ میر صفیر صاحب فرماتے ہیں:

پھر جائے . . . .

آپ نے کیا مصرعے لگائے ہیں"۔ آزاد نے مصرعے یوں عرض کیے:

کیا نشے کے ڈوروں کی چھری تیری ہے بڑھ کر — معشوق بھی کہتا ہے کہ اے وائے مقدر

یوں کہتا ہے دلبر کو کوئی عاشقِ مضطر — پھر جائے کہیں اُلٹی چھری شرم و حیا پر

حق میرا ترے نشے کے ڈوروں سے ادا ہو

یہ سُن کے ذوق پھڑک گئے اور کہنے لگے "سبحان اللہ سبحان اللہ"۔ غالب نے فرمایا "میر صاحب

کوئی تو شعر اچھا پڑھو۔" مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا:

شایانِ تکلّم جو نہیں ہم تو نہ ہوں خیر
اتنی تو رہے بات کہ غیروں میں نہ وا ہو

غالب نے فرمایا "اِس شعر میں اُس بات کا کچھ ذکر یا ایما نہیں ہے کہ قائل اِس کا کس بات کا اخفا غیروں سے چاہتا ہے۔" آزاد نے عرض کی کہ "حضور جیسا یہ شعر ہے ویسے ہی کمترین نے مصرعے لگائے ہیں۔" ارشاد ہوا "پڑھو"۔ آزاد نے یوں عرض کیے:

عریانِ تاثّم جو نہیں ہم تو نہ ہوں خیر — بربانِ تظلّم جو نہیں ہم تو نہ ہوں خیر
شریانِ تسلّم جو نہیں ہم تو نہ ہوں خیر — شایانِ تکلّم جو نہیں ہم تو نہ ہوں خیر
اتنی تو رہے بات کہ غیروں میں نہ وا ہو

ان مصرعوں پر ایسی تفریح ہوئی کہ غالب بھی متبسّم ہوئے۔ پھر مولوی صاحب نے جھلا کر یہ شعر پڑھا:

ہر داغ بنے سینے میں تصویر تمھاری
فرقت میں اگر مشق تصوّر کی سوا ہو

غالب نے یہ فرمایا "خیر یہ کچھ ہے مگر اس شعر میں عیب یہ ہے کہ داغ میں معشوق کی تصویر کا بنانا ترکِ ادب ہے، بلکہ اس کی توہین ہے جس نے شعر کو مٹا دیا"۔ مومن خان صاحب مرحوم نے آزاد سے مخاطب ہو کر کہا "ہاں جناب اس کے مصرعے سنائیے۔" آزاد نے عرض کیے:

لائی ہے غضب میں مجھے تاخیر تمھاری — زلفیں ہیں مرے پاؤں کی زنجیر تمھاری
بولو تو گھٹا دیں ابھی توقیر تمھاری — ہر داغ بنے سینے میں تصویر تمھاری
فرقت میں اگر مشق تصوّر کی سوا ہو

یہ مصرعے جو سنے تو مومن خان صاحب اور ذوق پھڑک گئے، اور واہ واہ و سبحان اللہ کی دھوم ہوئی۔ مومن خان صاحب نے غالب سے کہا "دیکھیے اس نازک خیال بلند طبع صاحبزادے نے مصرع گرہ کا کیا خوب لگایا ہے۔" غالب نے فرمایا کہ "یہ ہمیشہ سے بہت ہی عالی مضمون پیدا کرتا ہے اور

ماشاءاللہ نہایت ہی ذکی ہے ۔اللہ تعالیٰ اس کو نظرِ بد سے بچائے کہ یہ میرا یادگار ہے ۔" آزاد نے کھڑے ہو کر جھک جھک کے سب کو تسلیم عرض کی اور پھر مودب ہو بیٹھا ۔ مولوی صفیر صاحب اِن مصرعوں کو سُن کر ایسے خاموش ہوئے کہ منہ سے آواز نکلنی دشوار ہو گئی ۔ اُدھر سے مومن خان اور ادھر سے ذوق مرحوم نے کہنا شروع کیا کہ " واہ مولوی صاحب واہ آپ کا بھی کیا کہنا ہے ۔ ہاں اسی غزل کے اور شعر سنائیے ۔" مولوی صاحب نے بہ ہزار خرابی لکنت کے ساتھ گھبرا کر یہ شعر پڑھا :

بچھی ہوئی ہے پھولوں کی چادر سرِ مرقد
تم فاتحہ پڑھتے ہو کہ گلریز ادا ہو

"گلریز ادا ہو" کو سُن کر ایک ایک کا مُنہ تکنے لگا ، اور کہا " واہ مولوی صاحب گلریز ادا ہو کیا خوب فرمایا ہے ۔ ذرا پھر ارشاد ہو ۔" مولوی صاحب نے لوگوں کو سلام کیا اور پھر پڑھا :

بچھی ہوئی . . . .

ذوق اور مومن مرحوم نے آزاد سے کہا " ہاں میاں اِس کے مصرعے ۔" آزاد نے یوں عرض کیے :

الفاظ نکلتے ہیں دہن سے جو گداگد — اور تھوک گرا پڑتا ہے منہ سے جو لدالد
لکنت ہے کہ ہو پُھل جھڑی یا کرتے ہو تم رد — بچھی ہوئی ہے پھولوں کی چادر سرِ مرقد
تم فاتحہ پڑھتے ہو کہ گلریز ادا ہو

ان مصرعوں کا پڑھنا تھا کہ اُدھر سے ذوق دوڑے اور اُدھر سے مومن اور دونوں نے آتے ہی آزاد کو گلے لگا لیا ۔ غالب مرحوم نے ہاتھ بڑھا کر پیٹھ ٹھونکی اور فرمایا " مرحبا ماشاءاللہ ۔" مومن خان نے فرمایا کہ بھئی خدا کے واسطے پھر ان مصرعوں کو پڑھو ۔" آزاد نے پھر پڑھے ۔ پھر کہا اور پڑھو ۔ آزاد نے پھر پڑھے یہاں تک ذوق نے اس شعر کو اور ان مصرعوں کو لکھ لیا ۔ مولوی صاحب کی یہ حالت ہوئی کہ ندامت اور غصے سے اُن کا چہرہ بدل گیا ۔ ناخوش ہو کر فوراً وہاں سے اُٹھ جانے کا ارادہ کیا ۔ لوگوں نے روکا اور بہ معذرت تمام پھر مولوی صاحب کو بٹھایا ۔ ناسخ نے بہ منت اور شعر پڑھنے پر راضی کیا ۔ مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

ہر گام اُبھر آتے ہیں پاپوش کے بُوٹے
جیسے ترے پاؤں سے لگی نشو و نما ہو

آزاد نے یہ مصرعے عرض کیے :

پھر گام فقط اور وہ پاپوش کے بُوٹے ۔ کیوں کر کوئی اِن لفظوں پہ سینے کو نہ کُوٹے
ہم نے تو مزے خوب ہی اس شعر کے لُوٹے ۔ ہر گام اُبھر آتے ہیں پاپوش کے بُوٹے
جیسے ترے پاؤں سے لگی نشو و نما ہو

ان مصرعوں پر بھی لوگ پھڑک گئے مگر اس خیال سے کہ مولوی صاحب امرِ حق پر بُرا مان جاتے ہیں، لوگ خاموش رہے ۔ مگر پھر بھی کنایۃً لوگوں نے آزاد کی تعریف کر دی ۔ پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

کہتی ہیں؎ زباں کانٹوں کی ہو کر مری پاپوش
اے آبلہ پا گرم روِ راہِ فنا ہو

آزاد نے یہ مصرعے عرض کیے :

دیوانے پہ بے جاتے ہیں دھو کر مری پاپوش ۔ کیوں ننگا پھرایا مجھے کھو کر مری پاپوش
میں کیا کہ لگائے گی نہ ٹھوکر مری پاپوش ۔ کہتی ہیں؎ زباں کانٹوں کی ہو کر مری پاپوش
اے آبلہ پا گرم روِ راہِ فنا ہو

مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

ہوں کُشتۂ خاموشیٔ چشمانِ سخن گو
جیسے کہ اشاروں میں کوئی بول رہا ہو

آزاد نے یہ مصرعے عرض کیے :

باتوں سے تو کشتہ ہوئے پھر بولتے کیا ہو ۔ مطلب جو تمھارا ہے ذرا تم بھی تو سمجھو
ترکیبِ مضامیں کو تو اس شعر کے دیکھو ۔ ہوں کشتۂ خاموشیٔ چشمانِ سخن گو
جیسے کہ اشاروں میں کوئی بول رہا ہو

پھر مولوی صاحب نے کہا "اس کے مصرعے تو فرمائیے ۔" آزاد نے عرض کی : "شعر ارشاد ہو"۔ مولوی صاحب نے شعر پڑھا :

؎ صحیح : ہے

سینے میں پہنچ جاتی ہیں آساں تری نظریں
سُرمے میں ترے دل کا سویدا نہ پسا ہو

آزاد نے مصرعے عرض کیے:

قربان میں ان لفظوں کے "آساں تری نظریں" — سُرمے کی طرح دل کے سویدا کو بھی پیسیں
اللہ رے شرمایا کہ نہیں دیر پھر اُس میں — سینے میں پہنچ جاتی ہیں آساں تری نظریں
سُرمے میں ترے دل کا سویدا نہ پسا ہو

ان مصرعوں پر بھی غالب مسکرائے۔ پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا:

اے بے خودیٔ لذتِ دیدار دہائی
آنے کو پلٹ کر کہیں وہ کہہ نہ گیا ہو

آزاد نے یہ مصرعے عرض کیے:

اے زمزمۂ بلبلِ گفتار دہائی — اے نازکیٔ معنیٔ اشعار دہائی
اے برہمیٔ مصرعِ بیکار دہائی — اے بے خودیٔ لذتِ دیدار دہائی
آنے کو پلٹ کر کہیں وہ کہہ نہ گیا ہو

ان مصرعوں کو سُن کے تو لوگ بے اختیار ہو گئے۔ غالب نے فرمایا "ان تین مصرعوں کی دہائی نے بہت ہی لطف دیا۔ ماشاء اللہ کس قدر حسین پیرائے میں مولوی صاحب کے شعر کی غلطی بیان کی ہے"۔ ذوق اور مومن نے تعریف فصاحت کی کی اور فرمایا کہ "ان مصرعوں کو پھر پڑھیے"۔ آزاد نے پھر یہ مصرعے پڑھے۔ ناسخ مرحوم نے کہا "پھر ارشاد کیجیے"۔ آزاد تیسری مرتبہ مصرعے پڑھنے کو تھا کہ مولوی صاحب نے غصّے میں آ کر آزاد کو تیسری مرتبہ وہ مصرعے پڑھنے نہ دیے اور اپنا یہ شعر پڑھا:

بلبل ترے ہم جنسوں کی ایسی نہیں آواز
صیاد نہ ٹٹّی میں کہیں بول رہا ہو

ناسخ اس شعر کو سُن کے بہت بھیانک ہوئے اور کہنے لگے کہ "جناب مولوی صاحب آپ پور

یا شعر بھی کبھی کہا ہے - ہاں جناب آزاد صاحب آپ مصرعے پڑھیے؟ آزاد نے مصرعے عرض کیے :

بلبل یہ نہیں اس میں تو گلدم کا ہے انداز   تیتر کی پٹیلوں پہ عبث کرتے ہو تم ناز

پڑ پڑ کی صدا کا عجب آہنگ ہے بیجاز   بلبل ترے ہم جنسوں کی ایسی نہیں آواز

صیاد نہ ٹٹی میں کہیں بول رہا ہو

ان مصرعوں کی ناسخ نے بہت تعریف کی۔ پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

دیکھے ستم دیدۂ بسمل کے کرشمے

قاتل ترا دل ٹکڑے نہ ہو جائے تو کیا ہو

آزاد نے یہ مصرعے عرض کیے :

کیسا وہ ستم دیدۂ بسمل کا ہے جس کے   دیکھے سے دلِ سخت بھی عاشق کا ہو ٹکڑے

اس شعر میں شاعر کے تو فی البطن ہیں معنے   دیکھے ستمِ دیدۂ بسمل کے کرشمے

قاتل ترا دل ٹکڑے نہ ہو جائے تو کیا ہو

ان مصرعوں پر بھی مولوی صاحب بگڑے اور کچھ توجیہہ بیان کرنی چاہی لیکن لکنت اور غصے سے کچھ کہہ نہ سکے۔ لوگوں کا منہ دیکھ کر رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ شعر پڑھا :

آؤ نہ مری گود میں احوال تو پوچھو

تم مجھ سے خفا ہو کہ مرے دل سے خفا ہو

اور لوگوں سے تعریف کے خواہاں ہوئے۔ آزاد نے اُسی وقت یہ مصرعے سنائے :

جو دل سے خفا کیوں نہیں وُہ تم سے خفا ہو   معشوق کو اک طفلِ دو سالہ تو نہ سمجھو

بہلاتے ہو کس چیز سے جو کہتے ہو اُس کو   آؤ نہ مری گود میں احوال تو پوچھو

تم مجھ سے خفا ہو کہ مرے دل سے خفا ہو

پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

اغیار کی تحریک مرے قتل میں تو ہے

اس وقت مری جان جو بخشو تو مزا ہو

ناسخ نے کہا "یہ 'تو ہے' کی کیا ہی بڑی [بُری ؟] ترکیب ہے اور مصرع ثانی نے عاشقی کے نام کو ڈبو دیا" آزاد نے مصرع عرض کیے :

تُو ہے' میں فصاحت جو ہے ظاہر ہے کہ جو ہے   مضمون میں کچھ لطف ذرا دیکھ تو لو ہے
مرنے کا بہت ڈر ہے مجھے بیدادگرو ہے   اغیار کی تحریک مرے قتل میں تو ہے
اس وقت مری جان جو بخشو تو مزا ہو

ناسخ نے ان مصرعوں کی بہت تعریف کی - پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

رعنائیاں اچھی نہیں ناوک فگنی میں
دیکھو مرے دل میں کوئی پیکاں نہ رہا ہو

آزاد نے مصرعے یوں سنائے :

رعنائیاں[1] اچھی نہیں ناوک فگنی میں   زیبائیاں اچھی نہیں ناوک فگنی میں
انگڑائیاں اچھی نہیں ناوک فگنی میں   رعنائیاں اچھی نہیں ناوک فگنی میں
دیکھو مرے دل میں کوئی پیکاں نہ رہا ہو

سب نے کہا "کیا خوب جیسا شعر ویسے ہی مصرعے" - پھر مولوی صاحب نے یہ شعر پڑھا :

اک جاں کے عوض وصل میسّر ہو تمھارا
لو مجھ سے قسم میرا جو نقصان ہوا ہو

آزاد نے یہ مصرعے پڑھے :

اس شعر میں ماضی کا عجب قافیہ چمکا   اور جاں نہیں باقی ہے تو پھر وصل ہے کیسا
حالاتِ گزشتہ کی نئی ہے یہ تمنّا   اک جاں کے عوض وصل میسّر ہو تمھارا
لو مجھ سے قسم میرا جو نقصان ہوا ہو

---

[1] یہ سہو کتابت ہے - یہی مخمس "تنبیہ صفیر بلگرامی" میں بھی ہے - وہاں "ہمتائیاں" ہے - (ص ۱۲۵)

جب مصرعے سنتے سنتے ندامت پر ندامت ہوئی تو مولوی صاحب نے غزل کو تمام کرکے جلدی سے یہ مقطع باآواز پست بہت ہی حزیں اور غمگین ہو کر پڑھا :

واماندۂ رہ کوئی نظر آتا ہے وہ دور
ہو تیرا صفیر آہ کہ نقشِ کفِ پا ہو

آزاد نے اس کے مصرعے یوں سنائے :

سننا ہو اگر ایسی غزل کا تمھیں منظور — آزاد سنو از دہنِ شاعرِ مغرور
وہ دور کو دیکھو گے تو ہو جاؤ گے مسرور — واماندۂ رہ کوئی نظر آتا ہے وہ دور
ہو تیرا صفیر آہ کہ نقشِ کفِ پا ہو

مولوی صاحب کی غزل پر آزاد کے مصرعوں کو سُن کر سب شعرا اس قدر محظوظ ہُوئے کہ ہر طرف سے صدائے تحسین و آفرین بلند ہُوئی۔ حضرت غالب مرحوم نے میر صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "مولوی صاحب اگر آپ کو شعر کہنے کا شوق ہے تو میرے نورِ نظر قرۃ العین سلمہ اللہ تعالیٰ یا اس کے شاگرد آزاد سے کیوں اصلاح نہیں لیتے۔ ان لوگوں کو کیوں نہیں اپنا کلام دکھاتے کہ اشعار آپ کے عیوب سے پاک ہو کر لائق سنانے کے ہو جائیں۔"

یہ سُن کر مولوی صاحب نے عرض کی "حضور میں نے ۲۵ برس تک صرف شعر کہنے کی مشق کی ہے اور اس عرصے میں ان ہی حضرات کا تتبع کیا ہے۔ ان ہی لوگوں کے خوانِ فصاحت کا زلہ رُبا رہا ہوں۔ لیکن فی الحقیقت انصاف یہ ہے کہ جناب آزاد کی طبیعت بہت ہی عالی ہے اور میرے کلام میں ہنوز جائے استاد خالی۔"

غالب نے فرمایا کہ "پھر آزاد سے کیوں اصلاح نہیں لیتے۔" مولوی صاحب نے کہا "بہت خوب اب ایسا ہی ہوگا۔" (ص ۲۵-۱۳)

۵ یہ جس قدر بیان ہے بالکل غلط۔ بات اتنی ہوئی کہ غزل اور خمسہ تمام ہونے کے بعد دوچار آدمی اور بھی آئے۔ نہ غالب نے استقبال کیا نہ مؤدب اُن کے سبب سے بیٹھے بلکہ سب جس طرح بیٹھے تھے بیٹھے رہے۔ وہ لوگ بھی آکر بیٹھے مگر غالب نے ان لوگوں کا اس قدر پاس کیا کہ حاضرینِ مجلس کو اُن سے اور اُن کو حاضرینِ مجلس سے روشناس کیا۔ (ص ۲۵)

۶ بھلا مولوی صاحب اس جھوٹ سے کیا حاصل۔ کہاں رودکی اہلِ فارس اور کجا آپ۔ اس کی بلا کو کیا غرض تھی کہ وُہ آپ کے اردو کلام کا مشتاق ہوتا۔ اس کو یہ دماغ کہاں کہ وہ آپ سے اردو میں گفتگو کرتا۔ آپ نے جھُوٹ بھی لکھا تو ایسا جو ہرگز قیاس میں نہ آئے۔ آپ کو یہ بھی خیال نہ ہوا کہ آزاد بھی اس مجلس میں حاضر تھا، دروغ کو اس کے سامنے کیونکر فروغ دے سکوں گا۔ خیر آپ نے اصل حقیقت کو مخفی کیا ہے تو میں اس کو ظاہر کیے دیتا ہُوں۔ اور وُہ یہ ہے کہ بعد تمام ہونے خمسے کے ناسخ نے آزاد سے اور بھی خمسہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ آزاد نے عرض کی کہ جناب مولوی صاحب غزل پڑھیں، آزاد اس پر مصرعے لگاتا جائے گا۔ چنانچہ ناسخ اور ذوق وغیرہ شعرا سب یکجا بیٹھے۔ مولوی صاحب نے اپنے دیوان کے انتخاب اشعار چُن چُن کر جو اُن کے نزدیک نہایت بہتر تھے، سنانے شروع کیے۔ اور آزاد نے اُسی وقت ہر ایک شعر پر مصرعے لگا دیے۔ (ص ۲۶)

[اس کے بعد صفیر کے متعدد اشعار پر آزاد نے مصرعے لگائے ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس لیے اشعار حذف کیے جاتے ہیں]

۷ جناب مولوی صاحب اس قدر جھوٹ، اور جھُوٹ بھی کیسا کہ سراسر جھُوٹ۔ کہاں آپ کے سادے رُوکھے پھیکے اشعار اور کہاں غالب کا ترجمان ہونا اور اہلِ فارس کا اُس کے سننے کے لیے اصرار۔ اس جگہ آپ ہی کی لکھی ہوئی مثل یاد آتی ہے کہ "اے ایاز قدرِ خود بشناس"۔ اب جو آپ کے کلام کے قبوحات آشکارا ہوئے اور اب جو لوگ آپ کے کلام پر اعتنا نہیں کرتے بلکہ مہمل سمجھتے ہیں تو اب آپ نے عاجز اور شرمندہ ہو کر یہ سمجھ لیا کہ میں عالی خیال ہوں عرفی اور غالب کو اپنا

کلام سناتا ہوں۔ اور اُن سے داد پاتا ہوں۔ مگر آپ کے نقصِ کلام کا شہرہ عالم میں محیط ہے اور ہر جگہ آزاد کی تسلیط، پھر خواب ہو یا خیال آپ کی کہیں بھی دال نہیں گل سکتی۔ (ص ۳۲)

[اس کے بعد (ص ۳۲ تا ص ۴۰) کی عبارتوں میں غالب کا ذکر نہیں ہے۔ صرف ایک جگہ (ص ۳۷) صبا کی زبانی یہ کہلوایا ہے "۔ ۔ ۔ ۔ آپ (آزاد) کی استادی کو میر صفیر صاحب نے ابھی اسی جلسے میں حضرت غالب کے رُوبرو تسلیم کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" مذکورہ صفحات کا زیادہ حصّہ صفیر کے اشعار کی تضمینوں پر مشتمل ہے]

۹ یہ بات محض غلط ہے۔ آزاد تو آپ کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے اور یہ جھوٹ۔ یاد کیجیے کہ جب حضرت غالب کے ارشاد پر رود کی نے چاہا کہ کچھ پڑھے تو حضرت غالب نے فرمایا کہ ملّا وحشی سے شروع ہو۔ چنانچہ پہلے ملّا وحشی نے چند بند پڑھے۔ (ص ۳۹-۳۸)

[اس کے بعد (ص ۳۹ تا ۴۶) مختلف فارسی شعرا کا کلام ہے]

الغرض محامد و اوصاف سخن پر اس جلسے کا اختتام اور آزاد کی حسن سعی کا بخیر انجام ہوا۔ حضرت غالب نے جلسے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "میر فرزند احمد صاحب جو فن شاعری کے خون کے پیاسے ہیں، میرے مخدوم و معظم حضرت صاحب عالم کے نواسے ہیں۔ اُن کی آگاہی اور تعلیم کے لیے یہ جلسہ قرار پایا۔ اچھے اچھے لوگوں نے کرم فرمایا۔ بہت سی باتیں مولوی صفیر صاحب کو معلوم ہوئیں اور لعنوانِ شایستہ ان کو ہر طرح اصلاح دی گئی۔ اب یقین ہے کہ میر صاحب شاعری کے آداب سے آگاہ اور اپنے اشعار کے قبوحات سے واقف ہو گئے ہوں گے۔ چونکہ اس وقت محض خود رو شاعری رہ گئی ہے، علم و فضل سے تو بہرہ نہیں، لوگ استادوں کے کلام سے وصل و ہجر، شراب و کتاب [کباب؟] گل و بلبل کے مضامین لے کر اپنے دہاتی بھاکے میں دو چار مضمون ملا کر دو چار شعر موزوں کر لیتے ہیں۔ اور اپنے ہی بھائی بھتیجے قرابت دار اور دس بیس اشخاص ناآشنائے رموزِ شاعری پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل، محرم کے سپاہی، ہولی کے گویتے ایسے لوگوں کو ہمراہ لے کر مشاعروں میں جا کر جھوٹ موٹ واہ واہ کا غل مچوا کر استاد بنا چاہتے ہیں۔ اور جن کی بدولت اس راہ کو دیکھا جن

کی صحبت سے فیض یاب ہوئے، اُنھیں کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ کبھی لوگوں کی فہرست لکھ کر اُن کو اپنا شاگرد بتاتے ہیں۔ کبھی لوگوں کے رقعوں میں استاد کا لفظ جعل بناتے ہیں۔ کبھی در پردہ کبھی صاف صاف اپنے استاد پر منہ آتے ہیں اور اپنی طرف نہیں خیال کرتے کہ ہم اپنے کلام میں کہاں کہاں منہ کی کھاتے ہیں۔ بے اصل اور جھوٹ تشبیہیں، جیسے یہ شعر:

آنکھ ہیں شیریں کی فرہادی تھا اوجِ بے ستوں
کوہ کے جبہہ پہ خونِ کوہکن مالیدہ تھا

بے محل و بے بنیاد اشارے، جیسے یہ مطلع:

غیروں میں میرے قتل کی کل دھوم ہو گئی
بس بس عنایت آپ کی معلوم ہو گئی

بیہودہ کنایے، جیسے یہ شعر:

اظہار عاشقی نے تو لی کوہکن کی جان
زیبا تھا حُسن ہی کو جو وہ خود نما ہوا

ناخوش و بے معنی ابہامات، جیسے یہ شعر:

تری نظریں چبھتی نہیں دل میں کچھ
خریدار ابھی آپ پیکاں نہیں

یا یہ شعر:

خوشی کا دن ہے لیلیٰ نے کیا ہے قصد ہاموں کا
اڑے گا اخترِ تقدیر جگنو بن کے مجنوں کا

اور بھونڈی تشبیہیں، جیسے یہ مطلع:

مجمع عشاق آتش رویوں کا گردیدہ تھا
حلقۂ پشمینہ پوشاں موئے آتش دیدہ تھا

بے محل اور بعید استعارے، جیسے یہ شعر:

موسمِ گل میں انا لیلیٰ کی نوبت آ گئی
نکہتِ گل موجۂ انفاسِ بلبل ہو گیا

نادرست اور نامطبوع تکلّفات ، جیسے یہ شعر:

چکھائی عقل نے اُلفت کی چاشنی مجھ کو
بغل میں بُت ہے نظر فضلِ کردگار پہ ہے

نامرغوب ایما و نامطبوع بیان ، جیسے یہ مطلع :

تم بُتو مجھ سے کرو سودا خدا کی راہ کا
زاہدوں کے واسطے گنبد ہے بسم اللہ کا

الغرض اسی طرح سے خود غلط انشا غلط املا غلط ایما غلط ، اپنا خیال نہیں کرتے۔ مگر استاد بننے کا شوق ہے۔"

یہ سُن کے مولوی صفیر صاحب عرق عرق ہو گئے اور بار بار صبؔا کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ کچھ بولیں۔ مگر صبؔا نے اتنا ہی کہا کہ "حضرت غالب جو کچھ فرماتے ہیں بالکل بجا ہے۔ آپ کے خود غلط ہونے میں شبہ کیا ہے۔ آپ کو اگر شاعری کا شوق ہے تو پہلے زبان اردو سے واقفیت بہم پہنچائیے۔ رموزِ شاعری سے واقف ہو کر عیوب شعر کی اپنے اصلاح کیجیے یا کسی کو بنظرِ اصلاح دکھائیے۔ ابھی اُستادی کا دعویٰ نہ کیجیے اور نہ اتنی تعلّی کی لیجیے۔ یہ کہہ کر صبؔا چُپ ہو رہے اور جلسہ برخاست ہُوا۔ (ص ۷۴ - ۷۶)

[اس کے بعد کی عبارت (ص ۷۸ تا ص ۸۴) میں غالبؔ کا ذکر نہیں ہے]

مخمسات بر غزلیات غالب

صفیر کے دیوان خمسہ جات (قلمی) میں غالب کی دو غزلوں اور ایک قطعے پر مخمس ملتے ہیں۔ یہ مخمس ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ صفیر نے غالب کے اشعار قدرے بے احتیاطی سے درج کیے ہیں، اس لیے حواشی میں صحیح متن (مطابق دیوان غالب نسخۂ عرشی) کی نشان دہی کر دی گئی ہے

(۱)

حال ہر دم کی خلش کا آشنا پائیں گے کیا ہر گھڑی میری خبرداری کو وہ آئیں گے کیا
چارہ سازی اپنی یہ احباب دکھلائیں گے کیا دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے[1] تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

دوستو آ آ کے کہتے ہو جو حالِ خانقاہ کیا سڑی ہوں میں نہیں کیا حال پہ اپنے نگاہ
صبح سے ہے دھوم یہ آئے وہ پہنچے واہ واہ حضرت ناصح جو[2] آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ[3] کہ سمجھائیں گے کیا

دم لے سینے میں دلِ بے تاب و مضطر کب تلک صبر تا چند اور تحمل آہ دلبر کب تلک
عرض خدمت میں کروں مطلب مکرر کب تلک بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
میں[4] کہوں گا حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

---

[1] بھرتے [2] گر [3] سمجھا دو [4] ہم کہیں گے

سو طریقوں سے انھیں جا یا کے سمجھاتا ہُوں میں　　پر اُنھیں مستِ تغافل رات دن پاتا ہُوں میں
ہائے یہ شوقِ شہادت اب تو گھبراتا ہوں میں　　آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

کیا نکالی دوست تو تدبیر یہ اچھی کہی　　کیا ہوا دو دن نہ اشکوں کی اگر ندی بہی
جوشِ وحشت کی نہ ہو گی یاں کسی دم کوتہی　　گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

ناوکِ مژگاں کے عاشق تیر سے بھاگیں گے کیوں　　زخمیٔ ابرو بھلا شمشیر سے بھاگیں گے کیوں
ناصح و احباب کی تدبیر سے بھاگیں گے کیوں　　خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

حُسن لوگوں میں نہ باقی ہے نہ وہ رنگت اسد　　وہ نزاکت ہے نہ وُہ شوخی نہ وہ صورت اسد
اب تو کرتا ہے صفیر اس شہر سے ہجرت اسد　　ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے کھائیں گے کیا　　(ص ۲۲)

(۲)

شب جو اس یار کی محفل میں مری قدر ہوئی　　لگا دینے مجھے اک چکنی سُپاری وہ پری
میں نے خوش کرنے کو اُس شوخ سے یہ بات کہی　　ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

واہمہ سخت پریشاں کہ اسے کیا لکھیے •　　حافظہ غور میں حیراں کہ اسے کیا لکھیے
فکر حیران و پریشاں کہ اسے کیا لکھیے　　خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

ہاں سرِ شمعِ شبستانِ گرامی لکھیے　　غنچۂ نخلِ گلستانِ گرامی لکھیے

قفلِ پُر نور قلمدانِ گرامی لکھیے مہرِ مکتوب عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے سرشگرفانِ خود آرا کہیے

بے گماں دزدِ حنائے یدِ خوباں لکھیے درجِ پُر نور دہن میں دُرِ دنداں لکھیے
نقشۂ بوسۂ رخسارۂ جاناں لکھیے مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

گرہِ خاطرِ جاناں کے مشابہ لکھیے سُمِ آہوئے بیاباں کے مشابہ لکھیے
ٹیکۂ جبہۂ خوباں کے مشابہ لکھیے خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

دیدۂ دوختۂ قیس سے نسبت دیجے دلِ افروختۂ قیس سے نسبت دیجے
داغِ اندوختۂ قیس سے نسبت دیجے اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رُخِ دلکشِ لیلا کہیے

بالیقیں گولیِ بندوقِ ستم کیجے فرض نقشِ انگشتِ حسینانِ اِرم کیجے فرض
جگنوے گردنِ پُر نورِ صنم کیجے فرض حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

نام میں صاف صفائے رُخِ خوبِ آفاق شکل میں داغِ دلِ صدمہ کشِ دردِ فراق
ذایقے میں صفت انگور کی اس پر مصداق وضع[1] میں اس کو سمجھ لیجیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

جیب میں اس کو گھڑی کہیے بصد جلوہ و ناز ڈھال میں پھول سمجھیے اسے بس خوش انداز
دہنِ یار میں چھالا اسے سمجھو دمساز صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہرِ نماز

---

[1] وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق

میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قطرۂ دریائے لطافت لکھیے　　کیوں اسے صاف حبابِ یمِ الفت لکھیے
کیوں اسے مثلِ خزف ریزۂ جنت لکھیے　　کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے مہرِ جہاں تاب تصور کیجے　　کیوں اسے حلقۂ گرداب تصور کیجے
کیوں اسے صورتِ مہتاب تصور کیجے　　کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیجے
کیوں اسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے داغِ میانِ دلِ لالہ لکھیے　　کیوں اسے زاہدوں کے جبہ کا گھٹا لکھیے
کیوں اسے دانۂ تسبیح سراپا لکھیے　　کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلا لکھیے
کیوں[1] اسے آتشِ نے ناقۂ سلما کہیے

ڈھونڈ ڈالا پےِ تشبیہ فلک سے تا ارض　　ساری دیں، مفت ملیں ہم کو مثالیں یا قرض
قول غالب کا یہ کرنا ہے صفیرؔ آپ سے عرض　　بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے　　(ص ۹۴)

۳

پھر وہی نالہ اور زاری ہے　　پھر وہی حالت اب ہماری ہے
تیغ قاتل کی انتظاری ہے　　پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

یاد پھر آیا یار کا ناخن　　چٹکی ہے دل میں لے رہا ناخن

---

[1] کیوں اسے نقشِ پےِ ناقۂ سلما کہیے

خون کرتا ہے پھر مرا ناخن　　پھر جگر ھو دنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

منظرِ چشمِ اہلِ سوز و گداز　　مرجعِ ناص کشتہ اند از
کعبۂ دادخواہِ کشورِ ناز　　قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

سر نے کھولی دُکانِ سودائی　　طبع نقصان کرنے پر آئی
پا نے بازارِ حُسن دکھلائی　　چشم دلّالِ جنسِ رسوائی
دل خریدار ذوق خواری ہے

حالِ عاشق نہ پُوچھیے کیا ہے　　خوف کی جا ہے رحم کی جا ہے
کہاں آرام اُس کو آتا ہے　　وہی صد رنگ نالہ فرسا[1] ہے
وہی صد گونہ اشکباری ہے

ربط ہے سوز سے گداز سے پھر　　واں چلا ہوں رہِ نیاز سے پھر
پستا ہوں یار دلنواز سے پھر　　دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

پھر اُسی خوش ادا پہ مرتے ہیں　　پھر اُسی پُر جفا پہ مرتے ہیں
پھر اُسی بے حیا پہ مرتے ہیں　　پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

گیا چوری مرا دلِ دم ساز　　نقب زن ہیں وہ چشمِ عربدہ ساز
ہوا حاضر ہے کوتوالِ نیاز　　پھر کُھلا ہے درِ عدالتِ ناز
گرم بازارِ فوجداری ہے

---

[1] نالہ فرسائی

نقدِ جاں دیتا ہوں میں ہو کر زیر　　نہیں لیتا نصیبوں کا ہے پھیر
ایسا راشی نہ ہو گا کوئی شیر　　ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

غم نے پھر فوجداری کی فی الحال　　خانہ جنگی ہوئی ہے رات کمال
آ کے دربار میں باستعجال　　پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریادِ[1] آہ و زاری ہے

ہوا رُوپوش پھر وہ غنچہ لب　　چھوٹے ہیں پیادگانِ رنج و تعب
ہو گا فیصل مقدمہ یہ اب　　پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشک باری کا حکم جاری ہے

گھر میں صاحب ہیں بیٹھے کیوں تنہا　　کریں اجلاس کوٹھی پر اب آ
مستغیثانِ عشق کا ہے پرا　　دیدۂ[2] و دل کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے

کیوں ہو اس طرح سے غمیں غالب　　کیوں صفیر ایسے ہو حزیں غالب
دل مقرر پھنسا کہیں غالب　　بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے　　(ص ۱۰۰)

---

[1] فریاد و آہ

[2] دل و مژگاں کا

متفرقات

صفیر کی آپ بیتی

صفیر نے "طبقات کرام ۔ ساداتِ بلگرام" میں اپنے جو حالات لکھے ہیں، وہ زیرِ نظر مقالے کے پہلے باب میں درج کیے گئے ہیں۔ ان حالات سے قبل صفیر نے مندرجہ ذیل تمہید لکھی ہے:

"عاصی نے ۱۲۷۰ھ میں اپنے سوانح عمری بزبان فارسی لکھنے شروع کیے تھے۔ انتخاب اُس کا لکھ دینا مناسب ہے کہ مذاق فارسی بھی ناظرین کو معلوم ہو جائے۔" (ص ۴۱۰)

فارسی عبارت کے بعد صفیر نے "سیر وسفر" کے عنوان کے تحت اردو میں دہلی، مارہرہ، فرخ آباد، بلگرام، قنوج، لکھنؤ، کان پور، الہ آباد، بنارس، غازی پور، آرہ، مظفر پور ترہت، دربھنگہ، چھپرہ، علی گنج سوان وحسین گنج، پٹنہ دانا پور، مونگیر اور بھاگل پور کے سفروں کی تفصیلات درج کی ہیں (ص ۱۷-۴۱۶)

صفیر کی مزید تصانیف

اس مقالے کے پہلے باب میں صفیر کی تصانیف کی تفصیل پیش کی گئی ہے صفیر کی کچھ اور تصانیف کا سراغ ملا ہے جن کا ذکر مذکورہ باب میں نہیں ہے۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے صفیر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی " گوہر عشق " کو

ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ بابت مئی ۱۹۷۰ء میں متعارف کرایا ہے (ص ۱۰-۳) - یہ ایک عشقیہ مثنوی ہے جو ۲۵۰ شعروں پر مشتمل ہے - سید مرتضیٰ حسین بلگرامی کے پاس جو قلمی نسخہ ہے وہ ۱۲۷۵ھ کا مکتوبہ ہے - موصوف نے مثنوی کا زمانۂ تصنیف ۱۲۶۴ھ اور ۱۲۷۰ھ کے درمیان متعین کیا ہے -

محولہ بالا مقالے میں (ص ۶) سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے بتایا ہے کہ صفیر کے شاگرد محمد اسمٰعیل مہر آروی نے ۱۳۰۷ھ میں صفیر کی وفات کے بعد "فسانۂ غم ناک" کے نام سے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں صفیر کی مختصر سوانح عمری اور قطعاتِ تاریخ وفات ہیں - یہ رسالہ شائع نہیں ہوا اور اس کا قلمی نسخہ مقالہ نگار کے پاس ہے - مہر نے اِس رسالے میں صفیر کی ۶۳ تصانیف کا ذکر کیا ہے -

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی نے اپنے ایک دُوسرے مقالے "عکسی زیارت" (ماہنامہ "آج کل" دہلی - فروری ۱۹۵۶ء) میں مہر آروی کی مرتبہ فہرست تصانیف صفیر شامل کی ہے - اس میں بعض ایسی کتابوں کے نام ہیں جن کا ذکر کسی دُوسری جگہ نہیں ملتا -

۱- چشمۂ کوثر - تذکرۂ مرثیہ گویاں

۲- مثنوی درجواب گلزار نسیم

۳- مثنوی در معرفت

۴- جغرافیۂ بلگرام

۵- رسالۂ عروض

۶- رسالۂ فنِ طباعت

۷- رسالۂ محاورات

۸- جوابِ نصاریٰ

۹- آئینۂ فصل

۱۰- گلستانِ مسرت

۱۱- گلدستۂ اوّلیں

۱۲- تحقیق اللسان در تحقیقِ اردو

مکاتیب غالب بنام صفیر کی مختلف اشاعتیں

صفیر کے نام غالب کے چھے مکتوب دستیاب ہوئے ہیں جو زیر نظر مقالے کے دوسرے باب میں شامل ہیں۔ صفیر کی زندگی میں ان مکتوبات کی جو اشاعتیں عمل میں آئیں، اُن کی تفصیل یہ ہے:

مکتوب: ۱ - مکتوبہ ۵ر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ مطابق ۱۲رمئی ۱۸۶۴ء۔

اشاعتِ اول: مرقع فیض ۱۲۹۵ء

اشاعتِ دوم: جلوۂ خضر۔ جلد دوم۔ ۱۳۰۷ھ

مکتوب: ۲ - مکتوبہ ۱۹ر یا ۲۶ر ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ

اشاعتِ اوّل: انشائے سبدِ گل ۱۲۹۸ھ

اشاعتِ دوم: مرقع فیض

اشاعتِ سوم: جلوۂ خضر۔ جلد دوم

مکتوب: ۳ - مکتوبہ ۸ر ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ

اشاعتِ اوّل: انشائے سبدِ گل

اشاعتِ دوم: مرقع فیض

اشاعتِ سوم: جلوۂ خضر، جلد دوم

مکتوب: ۴ - مکتوبہ ۲۵ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ

اشاعتِ اول: انشائے سبدِ گل

اشاعتِ دوم: مرقع فیض

اشاعتِ سوم: جلوۂ خضر۔ جلد دوم

مکتوب: ۵ - مکتوبہ ۲۵ر ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ کے بعد اور ۷ر ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ سے قبل

اشاعتِ اوّل: انشائے سبدِ گل

مکتوب: ۶ - مکتوبہ ۷ر ذی الحجہ ۱۲۸۱ھ

اشاعتِ اوّل: مرقع فیض

اشاعتِ دوم: جلوۂ خضر، جلد دوم

اس تفصیل سے واضح ہے کہ ایک مکتوب (شمار : ۵) صرف "انشائے سبد گل" میں چھپا ہے۔ دو مکتوب (شمار : ۱و ۶) صرف "مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں ہیں۔ باقی تین مکتوب تینوں کتابوں میں ملتے ہیں۔

"انشائے سبد گل" کی طباعت مکمل نہیں ہوسکی تھی، اس لیے یہ کبھی منظرِ عام پر نہیں آئی۔ اس کے چند مطبوعہ اجزا سیّد وصی احمد بلگرامی مرحوم کے کتب خانے میں ہیں۔ سیّد صاحب موصوف نے اس مجموعے میں شامل غالب کے ایک مکتوب (شمار : ۵) کا اقتباس ("مولوی سیّد فرزند احمد سے لے کر" "پہنچاتے ہیں" تک) اپنے مضمون "س ش ص" (ماہنامہ "ندیم" گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ء) میں شامل کیا تھا۔

رسا ہمدانی نے غالب کا مذکورہ مکتوب (اقتباس) محولہ بالا مقالے سے اخذ کرکے اپنی کتاب "نادر خطوطِ غالب" (لکھنؤ ۱۹۳۹ء) میں شامل کیا۔ سیّد وصی احمد بلگرامی نے مکتوب کے بعض الفاظ حذف کرکے اُن کی جگہ نقطے لگائے تھے۔ رسا ہمدانی نے نقطے حذف کرکے عبارت کو مسلسل کردیا، اور شروع میں مقام و تاریخ (دہلی، ۲۸ نومبر ۱۸۶۳ء) کا اور آخر میں "نجات کا طالب، غالب" کے الفاظ کا اضافہ کردیا۔ اس طرح اقتباس کو مکمل خط بنا دیا گیا۔

"انشائے سبد گل" میں شامل چاروں مکاتیب کے متن پہلی بار مکمل صورت میں زیرِ نظر مقالے کی پہلی اشاعت (سہ ماہی "صحیفہ" لاہور، غالب نمبر، جلد سوم و چہارم ۱۹۶۹ء) کے ذریعے پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آئے۔ دوسری مرتبہ یہ مکاتیب سہ ماہی "تحریر" دہلی کے غالب نمبر میں مالک رام نے شائع کیے۔

"انشائے سبدِ گُل" کے چودہ صفحات (۱، ۲ تا ۴، ۱۳، ۲۱ تا ۲۴) کے عکس ڈاکٹر ظفر اوگانوی نے سیّد وصی احمد بلگرامی مرحوم سے حاصل کیے تھے۔ "تحریر" میں انھیں صفحات کا متن شائع کیا گیا ہے۔ اصل اوراق کرم خوردہ تھے، پھر ان کے عکس بھی درست نہیں بن سکے، اس وجہ سے مالک رام کے پیش کردہ متن میں غلطیاں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ایک اقتباس بطور مثال پیش کیا جاتا ہے۔

"ناسخ :

زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

..... یا ی تحتانی 'کبھی' کی دب گئی۔اسی طرح .... . زیادہ مثالیں نہ لکھیں کہ ..... ان سے واضح ہوں گے۔

خیال آتا ہے کہ یہ مطلع حضور کا ہے ۔ دیوان آپ کا اس وقت موجود نہیں :

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

'بھی تو ویراں' 'ابھی کچھ' کے وزن پر ہے۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ فی الحقیقت فلاں ہے۔ مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوص فارسی وعربی ہیں۔ اردو میں نہ تھے، نہ ہیں، نہ ہوں گے۔ حضور محقق اور راغبِ فارسی ہیں۔ یہ باتیں کھٹکتی ہوں گی۔ لیکن ہر زبانے و ہر بیانے، اپنا اپنا اجتہاد ہے۔" (تحریر، محولہ بالا، ص ۱۷۴)

"انشائے سبدِ گُل" کے مطبوعہ صفحات میں یہ اقتباس اس صورت میں ہے:

"ناسخ :

خُوں رُلاتا اُسے ناسور بنا کر گردوں
زخم بھی گر مرے تن پر کبھی خنداں ہوتا

'کبھی خنداں' بر وزنِ فعلاتن میں یائے تحتانی 'کبھی' کی دب گئی۔ اسی طرح 'ابھی کچھ با' فعلاتن کے وزن پر ہے۔ زیادہ مثالیں نہ لکھیں کہ .... [کرم خوردہ] سے واضح ہوں گی۔ اور دہلی بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ خیال آتا ہے کہ یہ مطلع حضور کا ہے۔ دیوان آپ کا اس وقت موجود نہیں :

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

"بھی تو ویراں' فعلاتن کے وزن پر ہے۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔ فی الحقیقت خلاف ہے۔ مگر یہ قواعد ابھی تک مخصوصِ فارسی وعربی ہیں۔ اردو میں نہ تھے، نہ ہیں، نہ ہوں گے۔ یہ باتیں جی میں کھٹکتی ہوں گی۔ خیر ہر زبانے و ہر بیانے، اپنا اپنا اجتہاد ہے۔" (ص ۲۰-۱۹)

"مرقعِ فیض" میں پانچ مکتوبات ہیں (شمار: ۲ تا ۴)۔ ان میں سے تین "انشائے سبدِ گل" اور "جلوۂ خضر" میں بھی ہیں۔ اور دو (شمار: ۱ و ۶) صرف "جلوۂ خضر" میں ہیں۔ گویا "مرقعِ فیض" میں وہی پانچ مکتوب ملتے ہیں جو "جلوۂ خضر" میں ہیں۔

"مرقعِ فیض" میں شامل مکاتیبِ غالب میں سے دو (شمار: ۳ و ۴) سید وصی احمد بلگرامی مرحوم نے اپنے مقالے "س ش ص" میں بلا حوالہ درج کیے ہیں۔ مکتوب: ۳ کے سلسلے میں بلگرامی مرحوم سے یہ سہو ہوا کہ انھوں نے مکتوب کے آخر میں ۱۲ کے ہندسے کو تاریخ سمجھ لیا (کسی تحریر کے خاتمے پر لفظ "حد" کے اعداد۔ یعنی ۱۲ کا ہندسہ لکھا جاتا تھا)۔ بلگرامی مرحوم نے اصل تاریخ (۸ ر ذی قعدہ) کو نظر انداز کر کے ۱۲ ر ذی قعدہ لکھی۔

مکتوب: ۴ "س ش ص" میں مکمل طور پر درج نہیں کیا گیا۔ یہ مندرجہ ذیل عبارات پر مشتمل ہے:

"بعلاقۂ مہر" تا "فرزند احمد"

"اشعار گہر بار" تا "کر نہیں آتی"

"ورق ہیں" تا "۱۲۸۱ ہجری"

بلگرامی مرحوم نے حذف شدہ عبارات کے لیے ایک جگہ نقطے لگائے ہیں اور دوسری جگہ حذفِ عبارت کی صراحت نہیں کی۔

"نادر خطوطِ غالب" میں یہ دونوں خطوط "س ش ص" کے حوالے کے بغیر شامل کیے گئے ہیں، اور مکتوب: ۴ کی عبارت کو مسلسل کر دیا گیا ہے۔

"مرقعِ فیض" میں شامل مکاتیب کی طرف سب سے پہلے ڈاکٹر مختار الدین احمد نے توجہ دلائی۔ انھوں نے ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ کے جولائی ۱۹۵۲ء کے شمارے میں "غالب کے چند نایاب خطوط" کے نام سے ایک مقالہ چھپوایا جس میں "مرقعِ فیض" اور "جلوۂ خضر" کو سامنے رکھ کر خطوط کو مرتب کیا اور حواشی میں یہ بتایا کہ کون سی عبارت مذکورہ کتابوں میں موجود ہے یا نہیں۔ تاہم یہ متن بھی طباعت کی اغلاط سے پاک نہیں ہے۔ بعض ایسے الفاظ جو ایک کتاب میں ہیں، اور دُوسری میں نہیں، اُن کے بارے میں حواشی میں کوئی صراحت نہیں ملتی۔ مثلاً مکتوب: ۳ کی پہلی سطر کا آغاز "نورِ چشم" سے ہوتا ہے۔ "جلوۂ خضر"

میں "نورِ نظر" ہے۔ اسی خط کے شروع میں "حضرت" کا لفظ ملتا ہے، یہ "مرقع فیض" میں نہیں ہے۔ یہ اختلافات حواشی میں ظاہر نہیں کیے گئے۔

مکتوب: ۲ کا ایک جملہ یہ ہے "ایک صاحبزادہ میرے سپرد کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ تو اس کے کلام کو دیکھ لیا کر"۔ "مرقع فیض" میں "اور حکم دیا ہے" کے الفاظ ہیں "جلوۂ خضر" میں نہیں ہیں۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد نے یہ الفاظ شاملِ متن نہیں کیے۔

"مرقع فیض" اور "جلوۂ خضر" میں شامل مکاتیب دوسری بار قاضی عبدالودود نے ماہنامہ "آج کل" دہلی کے اگست ۱۹۵۲ء کے شمارے میں بعنوان "غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام" شائع کیے۔ قاضی صاحب کے پیش کردہ متن میں بھی طباعت کی اغلاط موجود ہیں کہیں الفاظ غلط درج ہوئے ہیں جیسے "نینگیزد" بجائے "برنینگیزد"۔ بعض الفاظ درج ہونے سے رہ گئے ہیں جیسے "نون معنی نفی" بجائے "نون مفید معنی نفی"۔ "مخفف اس کا پرستان" بجائے "مخفف اس کا بحذفِ تحتانی پرستان"۔ یہ تمام مثالیں مکتوب: ا کی ہیں۔ دوسرے خطوں میں بھی اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔

رسالہ "مشرب" کراچی، مقالات نمبر ۱۹۵۷ء میں "غالب کے کچھ اور خطوط" کے عنوان سے کاظم علی شاداں نے بھی "مرقع فیض" میں شامل مکاتیب شائع کیے تھے۔ (یہ مضمون تحسین سروری مرحوم کا ہے۔ ان کا اصل نام کاظم علی تھا)۔ ان مکاتیب میں بھی کتابت کی اغلاط موجود ہیں۔ مثلاً مکتوب: ۴ کا ایک جملہ "مرقع فیض" میں یوں ہے: "حضرت، آپ کا یہ احسان عظیم ہے، مجھ پر خصوصاً اور بالغ نظرانِ ہند پر عموماً"۔ رسالہ "مشرب" میں یہ جملہ اس طرح لکھا گیا ہے "حضرت یہ آپ کا احسان عظیم ہے کہ مجھ پر خصوصاً بالغ ہند پہ عموماً"۔ مقالہ نگار نے "مرقع فیض" کے متن کا "جلوۂ خضر" کے متن سے مقابلہ نہیں کیا۔

مکاتیب غالب بنام صفیر کا جو متن ڈاکٹر مختار الدین احمد کے محولہ بالا مقالے میں پیش کیا گیا ہے، اسے ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب "غالب کی نادر تحریریں" (دہلی ۱۹۶۱ء) میں بھی شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے ڈاکٹر مختار الدین احمد کے حواشی حذف کر دیے ہیں، اس لیے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی عبارات صرف "مرقع فیض" میں ہیں اور کون سی صرف "جلوۂ خضر" میں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب میں "نادر خطوط غالب" کے حوالے سے غالب کا ایک مکتوب بنام صفیر (شمارہ: ۵)

شامل کیا ہے۔ اور اسے جعلی قرار دیا ہے۔ یہ مکتوب جعلی نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے زیرِ نظر مقالے کا دُوسرا باب۔

"خطوط غالب" مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؔ (لاہور، ۱۹۶۹ء) میں صفیر کے نام کے سات مکاتیب شامل ہیں۔ مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ انھوں نے یہ خط کہاں سے اخذ کیے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے رسالہ "آج کل" محولہ بالا میں جو مکاتیب شائع کیے تھے، مولانا مہر نے انھیں بلا حوالہ "خطوطِ غالب" میں شامل کر لیا ہے۔ "آج کل" میں طباعت کی جو غلطیاں تھیں، وہ یہاں بھی موجود ہیں۔ مزید اغلاط کا بھی خاصی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً مکتوب: ا میں مندرجہ ذیل اغلاط ملتی ہیں:

غلط	درست
حضرت صاحب عالم کو	حضرت صاحب عالم صاحب کو
غائبانِ خاص	غائبانِ حاضر
نظماً اور نثراً	نظماً او نثراً
نینگیزد	بر نینگیزد
رسم ہے	اسم ہے
اُس کا پرستان	اُس کا بحذفِ تحتانی پرستان
فرزند احمد کے نام	فرزند احمد صاحب کے نام

اس خط کا ایک جملہ: " 'بر' لفظ زاید اور نون مفید معنی نفی۔ لفظ زاید ماقبل کلمہ چاہیے"، مولانا مہر کے پیش کردہ متن میں موجود نہیں۔ مکتوب کے آخر میں تاریخ "یوم الخمیس ذی الحجہ و ۱۲ رمئی سال حال" درج ہے۔ مکتوب کا سال تحریر ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۴ء ہے۔ ۱۲ رمئی کی مطابقت ۵ ر ذی الحجہ سے ہوتی ہے لیکن مولانا مہر نے تاریخ ۱۲ ر ذی الحجہ لکھی ہے۔ اس مکتوب میں اغلاط کی جو کیفیت ہے، اُس سے دوسرے مکاتیب کے متن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

"نادر خطوط غالب" میں جن دو مکاتیب (شمارہ: ۴ و ۵) کے اقتباسات کو بطور مستقل مکاتیب کے شامل کیا گیا ہے، مولانا مہر نے انھیں بھی بلا حوالہ اپنی کتاب میں شامل کر لیا ہے۔ مکتوب: ۴ کا متن قاضی عبدالودود کے محولہ بالا مضمون سے بھی لیا ہے، اور وہ عبارتیں حذف کر دی ہیں

جو "نادر خطوطِ غالب" میں موجود ہیں۔ اس طرح ایک مکتوب، دو مکاتیب کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے اصل مکتوب کے بعض جملے درج ہونے سے رہ گئے ہیں۔ غالب کی نوشتہ تاریخ اصل مکتوب سے حذف کر دی گئی ہے، اور "نادر خطوطِ غالب" والے اقتباس کے آخر میں رہنے دی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں جگہ ایک ہی تاریخ تھی، مولانا مہر نے خیال کیا کہ ایک ہی تاریخ کے دو مکتوب نہیں ہو سکتے، اس لیے ایک جگہ سے تاریخ حذف کر دی۔

کتابیات

ذیل کی فہرست میں صفیر بلگرامی کی تصانیف شامل نہیں کی گئیں۔
ان کی تفصیلات اس مقالے کے باب اوّل میں ملاحظہ کی جائیں۔

کتابیں

آزاد ، سردار مرزا

توضیح المقال فی شرح محشرستانِ خیال۔ مطبع صبح صادق ، عظیم آباد۔

آزاد ، سردار مرزا

تنبیہ صفیر بلگرامی ۔ مطبع محمدی ، پٹنہ ۱۲۹۶ھ۔

امجد ، شیخ ریاض الدین

سیر دہلی ۔ مرتبہ : ڈاکٹر مختار الدین احمد ۔ مشمولہ رسالہ "صبح" دہلی شمارہ ۲ ، ۳ ، ۴ ۔ ۱۹۶۲ء۔

بلگرامی ، سید وصی احمد

مکتوبات (قلمی) ۔ مکتوبات صفیر و بنام صفیر

بلگرامی ، سید وصی احمد

نسب نامہ صفیر بلگرامی (قلمی)

بلگرامی، سید وصی احمد

یادداشت بابت تصانیف صفیر بلگرامی (قلمی)

ثابت رضوی، سید افضل حسین

دربار حسین ۔ دہلی ۱۹۲۲ء

خلیق انجم

غالب کی نادر تحریریں ۔ دہلی ۱۹۶۱ء

راز عظیم آبادی، سید عزیز الدین بلخی

تاریخ شعرائے بہار ۔ جلد اول ۔ پٹنہ ۱۹۳۱ء

رسا ہمدانی

نادر خطوطِ غالب ۔ کاشانۂ ادب، لکھنؤ ۱۹۳۹ء

سخن، خواجہ فخر الدین حسین

سروشِ سخن ۔ مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۳ء

سلطان، نواب تجمل حسین خاں عرف سلطان مرزا

مرقع فیض ۔ مطبع نور الانوار، آرہ ۱۲۹۵ھ

ظفر اوگانوی، ڈاکٹر

صفیر بلگرامی ۔ حیات و کارنامے ۔ کلکتہ ۱۹۷۶ء

عشرت، خواجہ عبد الرؤف

آب بقا ۔ لکھنؤ ۱۹۲۸ء

عیش، فدا علی

شعلہ جوالہ (مجموعۂ واسوخت) ۔ مطبع نول کشور، لکھنؤ ۱۲۸۵ھ

غالب، مرزا اسد اللہ خاں

خطوطِ غالب (دو جلدوں میں)

مرتبہ: غلام رسول مہر ۔ مجلس یادگار غالب، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور ۱۹۶۹ء

غالب، مرزا اسد اللہ خان
عود ہندی
مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل۔ مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء
غالب، مرزا اسد اللہ خان
دیوان غالب (نسخۂ عرشی)
مرتبہ: امتیاز علی عرشی۔ علی گڑھ ۱۹۵۸ء
قاضی عبدالودود
آثار غالب۔ مشمولۂ علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر۔ علی گڑھ ۴۹-۱۹۴۸ء
مالک رام
ذکر غالب۔ دہلی ۱۹۶۴ء
مختار الدین احمد، ڈاکٹر
علی گڑھ میگزین۔ غالب نمبر۔ علی گڑھ ۴۹-۱۹۴۸ء
ندوی، حکیم سید احمد اللہ
تذکرۂ مُسلم شعرائے بہار۔ جلد سوم۔ کراچی ۱۹۶۸ء
ہاشم، سید محمد
انشائے سبدِ گل۔ مطبع نور الانوار، آرہ ۱۲۸۹ھ

مقالات

بلگرامی، سید وصی احمد
س ش ص۔ رسالہ "ندیم" گیا۔ بہار نمبر ۱۹۳۵ء
بلگرامی، سید مرتضیٰ حسین
۱۸۸۳ء کے دو خطوط متعلق بہ غالب۔ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ فروری ۱۹۵۰ء

بلگرامی، سیّد مرتضیٰ حسین
مثنوی گوہر عشق۔ ماہنامہ "نیا دور"، لکھنؤ۔ مئی ۱۹۷۰ء
بلگرامی، سیّد مرتضیٰ حسین
عکسی زیارت۔ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ فروری ۱۹۵۶ء
شاداں، کاظم علی (تحسین سروری)
غالب کے کچھ اور خطوط۔ ماہنامہ "مشرب" کراچی۔ مقالات نمبر ۱۹۵۷ء
قاضی عبدالودود
میر صفیر بلگرامی اور مرزا غالب۔ سہ ماہی "اردو" دہلی۔ جنوری ۱۹۳۸ء
قاضی عبدالودود
غالب کے خطوط صفیر بلگرامی کے نام۔ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ اگست ۱۹۵۲ء
مختار الدین احمد، ڈاکٹر
غالب کے چند نایاب خطوط۔ ماہنامہ "نگار" لکھنؤ۔ جولائی ۱۹۵۲ء
مختار الدین احمد، ڈاکٹر
غالب کا ایک غیر مطبوعہ خط اور چند اصلاحیں۔ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ فروری ۱۹۵۵ء

غیر مطبوعہ ادبی تخلیقات کا مجموعہ

تخلیقِ ادب

پہلی کتاب

صفحات	۶۶۰
کاغذ	عمدہ - سفید
قیمت	پچاس روپے

دوسری کتاب

صفحات	۵۲۸
کاغذ	سفید - عمدہ
قیمت	پچاس روپے

مرتبین

یاسمین رحمٰن

مشفق خواجہ

آمنہ مشفق

عصری مطبوعات - کراچی

تخلیقی ادب

(۱)

ممتاز اہلِ قلم کی غیر مطبوعہ تحریروں کا مجموعہ

پہلی کتاب شائع ہو چکی ہے جس میں ان مصنفین کی تحریریں شامل ہیں ؛ جوش ملیح آبادی، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وزیر آغا، غلام عباس، ممتاز مفتی، محمد ہادی حسین، سلیم احمد، میرزا ادیب، شان الحق حقی، عبد العزیز خالد، جمیل الدین عالی، ادا جعفری، ڈاکٹر ریاض الحسن، سید انور، حمید کاشمیری، انور عنایت اللہ، احسن علی خاں، صدیق کلیم، رضیہ فصیح احمد، شمیم احمد، صلاح الدین عادل، اختر جمال، مرزا حامد بیگ، رضی اختر شوق، احمد ہمدانی، رفیق خاور، محمد سلیم الرحمٰن، انور سدید، جمیل آذر، نصر اللہ خاں، خواجہ محمد زکریا، مرزا ظفر الحسن، ڈاکٹر سلیم اختر، جمال پانی پتی، رشید امجد، رحمٰن شاہ عزیز، انوار احمد، شہزاد منظر، قیوم راہی، راشد مفتی، انور شعور، مہتاب ظفر، توصیف تبسم، غالب احمد، احمد جاوید، سیدہ شاہین حنیف، انور غالب، عمیم اختر، ظفر خاں نیازی، طاہرہ بلوچ۔

صفحات : ۶۶۰ قیمت : پچاس روپے

تخلیقی ادب

(۲)

اردو ادب کے دس سال

اس میں ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۹ء تک کے اردو ادب کے ۲۳ تفصیلی جائزے شامل ہیں۔ ادبی رجحانات، ناول، افسانہ، ڈراما، سفرنامہ، انشائیہ، خاکہ نگاری، طنز و مزاح، نظم، غزل، تنقید اور اسلامی ادب پر محمد علی صدیقی، شمیم احمد، عتیق احمد، شہزاد منظر، میرزا ادیب، انور سدید، جمیل آذر، غلام حسین اظہر، معین الدین عقیل، احمد ہمدانی، نظیر صدیقی، تحسین فراقی اور پروفیسر فروغ احمد کے مقالات۔

میرزا یگانہ ——— شخصیت اور فن

یگانہ کے فن پر ممتاز حسین، سلیم احمد اور قدرت نقوی کے مقالات۔ شخصیت پر بلند اقبال بیگم (بنت یگانہ)، تابش دہلوی، دوارکا داس شعلہ اور شیخ انصار حسین کے مضامین۔

یگانہ کی نادر تحریریں۔ ۹۵ غیر مطبوعہ خطوط۔ ۱۹ غیر مطبوعہ غزلیں۔ ۱۳۱ غیر مطبوعہ رباعیات اور بہت سا دوسرا غیر مطبوعہ کلام

صفحات: ۵۲۸

قیمت: ۵۰ روپے

چند اہم کتابیں

اُردو لسانیات
ڈاکٹر شوکت سبزواری

اپنی نوعیت کی اس منفرد کتاب میں اردو زبان کی اصل اور ابتدا، ارتقا، ساخت اور سرشت، اصوات و علامات، اعرابی نظام، روزمرہ و محاورہ، ترادفی مرکبات، دخیل الفاظ اور بعض دوسرے اہم مسائل پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ٹائپ میں عمدہ طباعت۔ صفحات ۱۹۶۔
قیمت: دس روپے

احسن الکلام
احسن مارہروی

دبستان داغ کے ممتاز شاعر مولانا احسن مارہروی کا مجموعۂ کلام۔ صفحات ۲۵۶۔
قیمت: دس روپے

زمان و مکان اور بھی ہیں
محمد حمزہ فاروقی

اردن، شام، لبنان، ترکی، آسٹریا، یوگوسلاویہ، ایران اور افغانستان کا سفرنامہ۔ حمزہ فاروقی نے ملکوں ملکوں گھوم کر بہت کچھ دیکھا اور جو کچھ دیکھا اسے خوب صورت انداز میں بیان کر دیا ہے۔ صفحات ۳۲۸۔ قیمت: اٹھارہ روپے

نشاطِ کرب
پاشا رحمان

نظموں اور غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت: پندرہ روپے

محمد عمر مہاجر۔ اقوال و آثار
مرتبہ: فریدہ عقیل

محمد عمر مہاجر کے حالات زندگی اور ادبی و علمی مضامین کا مجموعہ
قیمت: بیس روپے

عصری مطبوعات
اے/۳۲۲۔ بلاک ڈی۔ نارتھ ناظم آباد
کراچی ۳۳

چار کتابیں

جائزہ مخطوطات اردو

پاکستان کے سرکاری اور ذاتی کتب خانوں کے مخطوطات کا جائزہ۔ یہ محض روایتی فہرست سازی کا کام نہیں بلکہ ایسا سوانحی و کتابیاتی جائزہ ہے جس میں مصنفین اور ان کی تصانیف کے بارے میں ہر قسم کی ضروری معلومات یکجا کی گئی ہیں۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب۔ پہلی جلد شائع ہو چکی ہے۔ مصنف: مشفق خواجہ۔
ناشر: مرکزی اردو بورڈ لاہور۔ صفحات ۱۲۵۶۔ قیمت: سو روپے

اقبال از احمد دین

علامہ اقبال کے فکر و فن پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئی اور بعض وجوہ سے نذر آتش کر دی گئی۔ ۱۹۲۶ء میں پہلے ایڈیشن کے بعض حصے حذف کر کے، کچھ نئے مباحث کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع کی گئی۔ پہلا ایڈیشن نایاب اور دُوسرا کمیاب ہے۔ مرتب نے اس کتاب کو اس طرح ترتیب دیا ہے کہ دونوں ایڈیشنوں کے تمام مباحث یکجا ہو گئے ہیں۔ شروع میں طویل مقدمہ ہے جس میں مصنف کے حالات اور علمی کاموں کی تفصیلات کے ساتھ کتاب کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرتب: مشفق خواجہ۔
ناشر: انجمن ترقی اردو، کراچی۔ صفحات: ۵۲۰۔ قیمت: چالیس روپے

خوش معرکہ زیبا از سعادت خاں ناصر

یہ شعرائے اردو کا ایک اہم تذکرہ ہے جو قریباً ڈیڑھ سو سال پہلے لکھا گیا تھا۔ اسے کئی قلمی نسخوں سے مرتب کیا گیا ہے۔ شروع میں طویل مقدمہ ہے جس میں مصنف کے حالات اور تذکرے کی خصوصیات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مرتب: مشفق خواجہ۔ ناشر: مجلس ترقی ادب لاہور۔ صفحات جلد اول: ۶۸۰۔
قیمت: بائیس روپے پچاس پیسے، صفحات جلد دوم: ۶۸۶۔ قیمت: چوبیس روپے

ابیات

مشفق خواجہ کی غزلوں کا مجموعہ۔ ناشر: مکتبہ نیا دور، کراچی۔ صفحات: ۱۵۱
قیمت: پندرہ روپے

یہ کتابیں ہم سے طلب فرمائیں
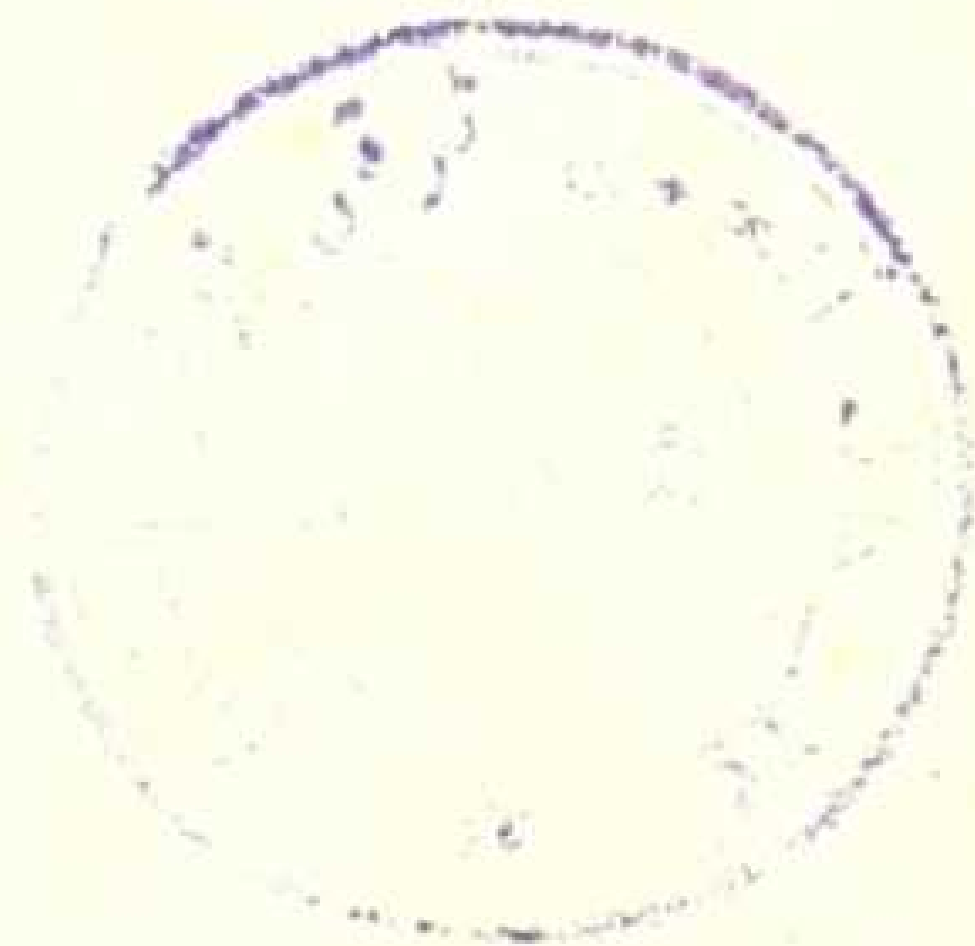
صاحب طرز نثر نگار اور شاعر ابن انشاء مرحوم
کی یاد میں یہ کتاب انجمن ترقی اردو ہند
کی لائبریری کو پیش کی جاتی ہے۔

غالبؔ کی عظمت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اُن سے وابستہ ہر شخص ہمارے ادب کا جیتا جاگتا کردار بن گیا ہے۔ اُن کے ممدوح ہوں یا شاگرد، دوست ہوں یا دشمن، رشتہ دار ہوں یا ملاقاتی، یہ سب غالبؔ کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں۔ لیکن صفیرؔ بلگرامی صرف اسی وجہ سے اہم نہیں ہیں کہ وہ غالبؔ کے شاگرد تھے۔ اُن کی اہمیت کی کئی اور وجوہ بھی ہیں۔ انھوں نے ایک شاعر، تذکرہ نگار، داستان گو، سوانح نگار، مورّخ، ناول نگار، قواعد نویس اور مکتوب نگار کی حیثیت سے بہت سے اہم کام انجام دیے۔ انھوں نے بے شمار شاگردوں کی ادبی و ذہنی تربیت بھی کی۔ شادؔ عظیم آبادی جیسا خوش فکر شاعر انھیں کا شاگرد ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں غالبؔ و صفیرؔ کے تعلقات کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ دونوں کی مراسلت اور ملاقاتوں کی روداد کے ساتھ وہ تمام تحریریں بھی یک جا کر دی گئی ہیں جو صفیرؔ نے غالبؔ کے بارے میں لکھی تھیں، اور شائع نہیں ہوئی تھیں یا شائع ہوئی تھیں تو اب عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں۔ مصنف نے بہت سی قلمی اور نادر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کر کے بہت سا ایسا مواد جمع کیا ہے جو پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔ اس میں غالبؔ و صفیرؔ کے بارے میں بہت سی نئی باتیں ہیں، اور دونوں کے ایک دوسرے کے نام خط پہلی مرتبہ صحیح اور مکمل صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔